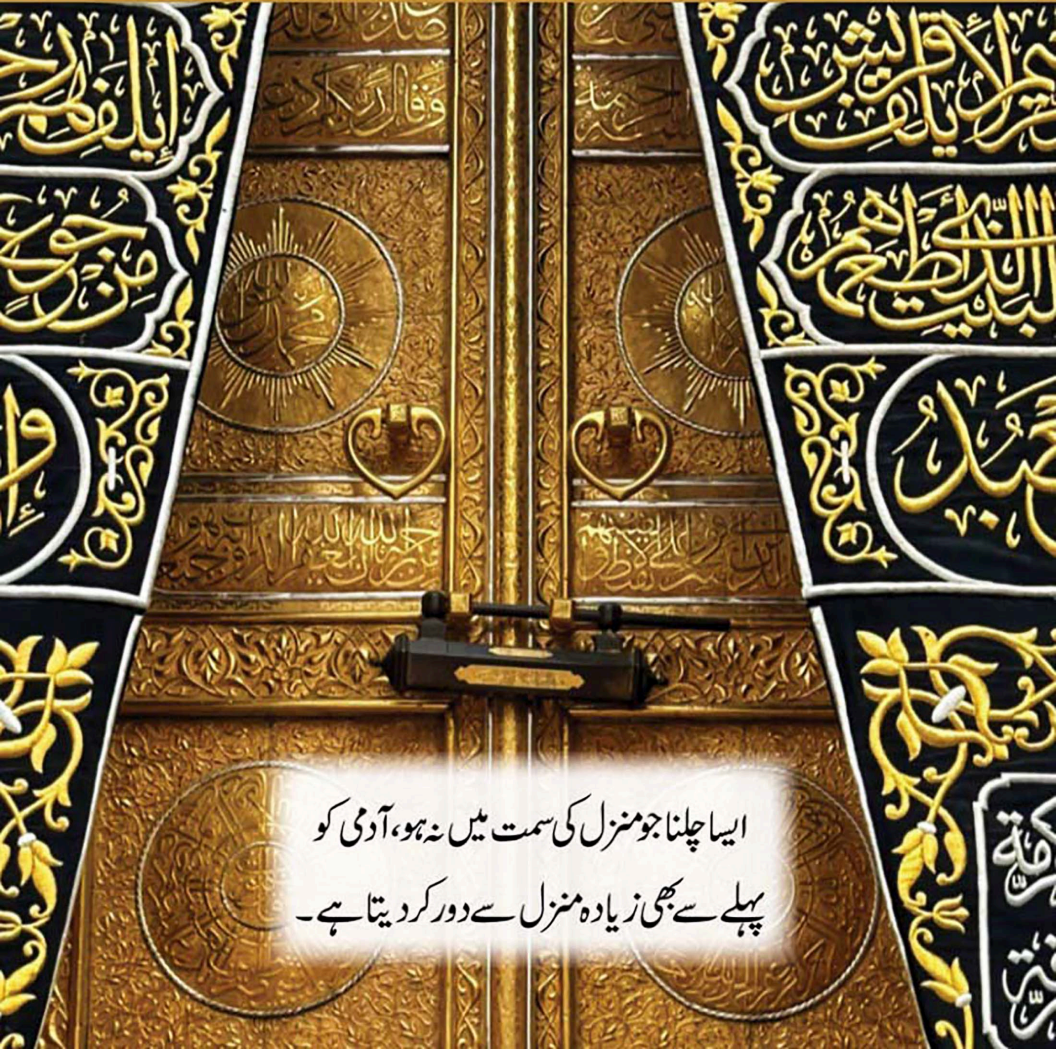




الرساله

Al-Risala

March-April 2026 • Rs. 50



ایسا چلنا جو منزل کی سمت میں نہ ہو، آدمی کو
پہلے سے بھی زیادہ منزل سے دور کر دیتا ہے۔

الرسالہ

Mar-Apr 2026 | Volume 51 | Issue 2

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr. Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013

Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: info@goodwordbooks.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹ 50 per copy
Subscription by Book Post	₹ 250 per year
Subscription by Regd. Post	₹ 450 per year
Subscription (Abroad)	US \$20 per year

Bank Details

Saniyasnain Khan
State Bank of India
A/c No: 30087163574
IFSC Code: SBIN0009109



To order books by
Maulana Wahiduddin Khan
please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

تحریر

مولانا وحید الدین خاں

فہرست

27	28	29	31	32	33	34	36	36	38	39	40	41	42	43	44	45	46	47	48	49	50	
دوست قرابت والا	قربانی کیا ہے	دور زوال	جنت آخرت	دو طریقے	ضروری تیاری کے بغیر	کامیاب شادی کا لازماً پینڈیشنٹ	صلحائے امت	غیر فطری اختلاف	ترقی کا زینہ	آج کی نوجوان نسلیں	مجمہوریت کا دور	کامیابی بھی ناکامی ہو سکتی ہے!	ذہین لوگوں کا قبرستان	ہر چیز ایک پروفیشن	سکھنے کی اہمیت	علم کا اٹھ جانا	مخالفیت یا غلط فہمی	عصری اسلوب میں اسلامی دعوت	امر بالمعروف، نہی عن المنکر	ناکامی کا مثبت پہلو	پیغام	اسلام کا نیا دور
عالم، خطباز زیادہ	عالم کا مقام	سبق آموز	ترہیت شعور	نیم کے ذریعے مدد	علم اور تقویٰ	سائنٹفک مزاج	دارالعلوم، یو بی ایڈ کا ایک واقعہ	جانا ہے بہت دور	اسلام کی خدمت	مدرسہ کلچر	دینی مدارس	ذہنی جمود کا نقصان	دور دنیاؤں کا فرق	زمانے سے بے خبری	موجودہ دینی مدارس	امام ابوحنیفہ کا معاشی مسلک	ہمارے مدارس	ایک سبق آموز واقعہ	ناموافق حالات ترقی	کا زینہ بن گئے	تعمیر گیت	تعمیری پیغام

کوروبانی کی ہکریکرت	1
پرتی کا تمک کوروبانی	3
ہج: ایک چتا و نئی	5
جیون کے اس پار	6
لاڈ۔ پھار کا سکنٹ	8
لکھیہی ن دؤڈ	9
اےک بھتار بھویض کی اور	10
سبن اور سھن شالیلتا	11
ھلال کو ھرام بنانا	12
پھلی جیندگی، دوسری جیندگی	13
اثر پھرن اپواد	14
سکنٹ پھ شکتی کا مھتھ	15

دوست قرابت والا

اگر آپ کوئی اردو اخبار پڑھیں یا کسی مسلمان کے ساتھ کچھ دیر بیٹھیں تو آپ کو یہ یقین ہو جائے گا کہ ساری دنیا اسلام کی دشمن بنی ہوئی ہے۔ ساری دنیا بطور خاص امریکا، یہود اور ہندو اس سازش میں لگے ہوئے ہیں کہ دنیا سے اسلام کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ مگر کیا معاملہ واقعی ایسا ہی ہے۔ اگر آپ زمینی سطح پر غیر مسلم افراد سے ملیں تو آپ کو حقیقت حال بالکل اس کے برخلاف نظر آئے گی۔ پوری دنیا کے تمام لوگ اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ان کو وہ چیز ملے جو ان کی فطرت کی پکار ہے۔

اسلام اسی پکار کا جواب ہے۔ سی پی ایس انٹرنیشنل کا مقصد یہ ہے کہ ساری دنیا میں قرآن کو انسان کی قابل فہم زبانوں میں عام کیا جائے۔ اس مقصد سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے، وہ ذیل کے تاثر سے معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ تاثر ایک اسپینش خاتون نے دیا ہے۔ ان کو اسپینی ترجمہ قرآن عرب امارات میں ایک سی پی ایس ممبر نے دیا تھا:

The Quran in Spanish is a blessing. I am very grateful to have the word of God in my language and in physical form. It is very easy to understand and makes you want to read it. I think it is very important that each person have a Quran in their language. It feels very comfortable and pleasant to have it. For example, I don't speak English very well or Arabic. I got it on the internet, but seeing it, touching it, and being able to read it without language restrictions is wonderful.

یہ اور اس طرح کے ہزاروں واقعات اس دنیا میں ہر دن پیش آرہے ہیں، جو یہ بتاتے ہیں کہ دوسرے انسان اسلام اور مسلمانوں کے دشمن نہیں ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دوسرے انسانوں کو دشمن سمجھنے کا رویہ ترک کریں، بلکہ وہ ان کے ساتھ یک طرفہ طور پر خیر خواہی کا طریقہ اختیار کریں۔ اس کے بعد یہ ہوگا کہ نہ صرف عام انسان آپ کا گرویدہ ہو جائے گا، بلکہ جو بظاہر دشمنی پر آمادہ ہو، وہ بھی آپ کا دوست بن جائے گا، جیسا کہ قرآن (41:34) میں اللہ تعالیٰ نے یقین دہانی کرائی ہے: اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جو اب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔ (ڈاکٹر فریدہ خانم)

قربانی کیا ہے

عید اضحیٰ کی قربانی کا ذکر قرآن کی سورۃ الصافات میں آیا ہے۔ متعلق آیات کا ترجمہ یہ ہے:

(ابراہیم نے کہا) اے میرے رب! مجھے ایک صالح (فرزند) دے۔ تو ہم نے اس کو ایک تحمل والے فرزند کی بشارت دی۔ پس جب وہ اس کے ساتھ چلنے پھرنے کی عمر کو پہنچا، اس نے کہا، اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں تو دیکھو کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ اسماعیل نے کہا: اے میرے باپ، تم کرو، جس کا تم کو حکم دیا جا رہا ہے (يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ)۔ تم پاؤ گے، مجھے، ان شاء اللہ صبر کرنے والوں میں سے (سَتَجِدُنِي اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ)۔ پس جب دونوں نے خود کو رب کے حوالے کر دیا، اور ابراہیم نے اس کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔ ہم نے اس کو آواز دی، اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا! بیشک ہم محسنین کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں (قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ)۔ بیشک یہ کھلا ہوا امتحان تھا۔ اور ہم نے اس کو ایک عظیم قربانی کے عوض چھڑا لیا۔ (37:100-107)

ان آیات پر غور کیجیے، اور دیکھیے کہ خواب کیا تھا، اور پیغمبر ابراہیم نے جو کیا، وہ کیا تھا۔ خواب بظاہر بیٹے کے ذبیحہ کا تھا۔ لیکن حضرت ابراہیم نے اس کے بدلے جس چیز کو ذبح کیا، وہ عملاً ایک دنبہ تھا، نہ کہ بیٹا۔ اس قربانی کو قرآن میں ذبح عظیم قرار دیا گیا۔ گویا کہ وہ عمل جو اسماعیل کے ساتھ کیا گیا، وہ ذبح عظیم تھا، اور وہ عمل جو دنبہ کے ساتھ کیا گیا، علامتی قربانی تھی۔ مطلوب قربانی یہ تھی کہ بیٹے کو ذبح کیا جائے۔ اس مطلوب کو پیغمبر ابراہیم نے کس طرح پورا کیا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ پیغمبر ابراہیم نے اپنے بیٹے کو عرب کے غیر ذی زرع (بے آب و گیاہ) صحرائیں ان کی ماں کے ساتھ آباد کر دیا۔

افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (آپ وہ کیجیے، جس کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے) کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم اور اسماعیل دونوں نے حکم خداوندی کی پوری طرح تعمیل کی، اور وہ تعمیل یہ تھی کہ انھوں نے اسماعیل اور باجرہ کو صحرائیں میں ایک نئی نسل کی تیاری کے لیے وقف کر دیا۔ یہ تاریخ کی، بلاشبہ، سب سے بڑی مقصدی قربانی تھی۔ اس لیے قرآن نے اس کو ذبح عظیم کا نام دیا۔

اس عظیم قربانی کا جو نتیجہ سامنے آیا، وہ یہ تھا کہ اس صحرا میں تو والد و تناسل کے ذریعے ایک نسل تیار ہوئی، جو ماحول کی کنڈیشننگ سے پاک تھی۔ اس واقعے کی مزید تفصیل حدیث اور سیرت کی کتابوں میں آئی ہے۔ یہی وہ نسل ہے، جس میں پیغمبر ابراہیم کے تقریباً 2000 سال کے بعد اصحاب رسول پیدا ہوئے، جنہوں نے عظیم جدوجہد کے ذریعے وہ عالمی انقلاب پیدا کیا، جس کو ایک فرینچ مورخ ہنری پیرین (Henri Pirenne) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

It (Islam) had sufficed to change the face of the globe. Wherever it had passed the ancient States, which were deeply rooted in the centuries, were overturned as by cyclone; The traditional order of history was overthrown. (A History of Europe, London, 1955, p. 46)

یعنی، اسلام نے دنیا کا نقشہ بدل ڈالا۔ جہاں جہاں اسلام پہنچا، وہاں صدیوں سے انتہائی مضبوطی کے ساتھ جمی ہوئی قدیم ریاستوں کو گویا ایک طوفان کی مانند پلٹ کر رکھ دیا۔ تاریخ کا قدیم روایتی نظام ٹوٹ کر بکھر گیا۔

دورِ زوال

امتِ مسلمہ کے دورِ زوال کے بارے میں حدیث کی کتابوں میں بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ یہ روایتیں گویا پیشگی تنبیہ (advance warning) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان روایتوں کا مقصد یہ ہے کہ امت کے رہنما پیشگی طور پر زوال کی علامتوں کو جان لیں اور ان کی اصلاح کے لیے سرگرم ہو جائیں۔ اگرچہ اس معاملے میں امتِ مسلمہ کا حال بھی عملاً وہی ہوا جو پچھلی امتوں کا ہوا تھا، یعنی پیشگی تنبیہات کے باوجود اصلاحِ حال میں ناکامی۔ اس کی وجہ مسلمانوں کے درمیان رائج خیر امت کا خود ساختہ تصور ہے۔ قرآن (3:110) میں مذکور خیر امت کا مطلب خیر الامم یا افضل الامم نہیں ہے۔ امت کے اندر اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام باقی نہ رہے تو اللہ کے نزدیک امت کی حیثیت العیاذ باللہ، ملعون امت کی بن جائے گی، نہ کہ خیر امت کی۔ یہ امتباہ خود قرآن اور حدیث میں واضح طور پر دیا گیا ہے۔

جنتِ آخرت

ابن تیمیہ (وفات 728ھ) ساتویں صدی ہجری کے معروف عالم دین تھے۔ ان کے شاگرد کا نام ابن اقیم الجوزیہ (وفات 751ھ) نے ان کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے: **إِنَّ فِي الدُّنْيَا جَنَّةً مَنْ لَمْ يَدْخُلْهَا لَمْ يَدْخُلْ جَنَّةَ الآخِرَةِ** (مدارج السالکین، جلد 1، صفحہ 452)۔ یعنی، بیشک دنیا میں ایک جنت ہے، جو اس میں داخل نہیں ہوا، وہ آخرت کی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا انسان ایک آن دیکھی جنت کی تلاش کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اسی آن دیکھی جنت کو پانے کے لیے ساری عمر سرگرداں رہتا ہے۔ مگر کوئی شخص اس مطلوب جنت کو حاصل نہیں کر پاتا، یہاں تک کہ وہ دنیا سے چلا جاتا ہے۔ یہ آن دیکھی جنت کیا ہے۔ یہ جنت وہی ہے، جس کو انسان نے پیدائش کے وقت دیکھا تھا۔ لیکن اس کے بعد شجر ممنوعہ کا پھل کھانے کی وجہ سے وہ اس سے محروم ہو گیا۔ اب ہر شخص اس جنت میں داخلے کے لیے سرگرداں ہے۔ یہ جنت اگرچہ آج انسان کو حاصل نہیں۔ لیکن اس جنت کی طلب ہر انسان کے لاشعور میں پیوست ہے۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ وہ دوبارہ اپنی اس کھوئی ہوئی جنت کو پالے۔

قرآن میں ہے کہ اللہ رب العالمین انسان کو اس جنت میں داخل کرے گا، جس کی اسے پہچان کرادی گئی ہے (محمد، 6: 47)۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ دنیا کی زندگی میں وہ جنت کا اتنا زیادہ طالب بنے کہ اس کو فطرت میں بسی ہوئی اس جنت کی معرفت ہو جائے۔ جنت کی یہی معرفت ابدی جنت کا کلکٹ ہے۔ انسان کی اعلیٰ خواہشیں اسی جنت کا پیشگی تعارف ہیں۔ متلاشی انسان (seeker) وہ ہے، جو اپنی بڑھی ہوئی معرفت کے ذریعہ جنت کا تصوراتی ادراک کرتا ہے۔ غیب میں چھپی ہوئی جنت کا یہی گہرا ادراک ہے، جو آدمی کو یہ حوصلہ دیتا ہے کہ وہ قربانی کی قیمت پر اس کا طالب بن سکے۔ اگر ایسا نہ ہو تو کوئی شخص آج آنکھوں کے سامنے موجود دنیا کو قربان کر کے کل کی جنت کا امیدوار نہ بنے۔

دو طریقے

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ (السنة لابن ابی عاصم، حدیث نمبر 15)۔ یعنی تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس کی خواہش اس چیز کے تابع ہو جائے جو میں لایا ہوں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں عمل کرنے کے دو طریقے تھے ہیں۔ ایک ہے ہوی (اپنی خواہش) پر عمل کرنا، اور دوسرا ہے، ماجاء بہ الرسول (پیغمبر کے لائے ہوئے دین) پر عمل کرنا۔ آپ کے سامنے ایک حق آیا۔ آپ کے دل نے گواہی دی کہ یہ حق ہے۔ مگر اسی کے ساتھ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ احساس پیدا ہوا کہ اگر میں اس حق کا اعتراف کر لوں تو میرا درجہ نیچا ہو جائے گا۔ اب اگر آپ نے حق کو مان لیا تو آپ نے ماجاء بہ الرسول پر عمل کیا اور اگر آپ نے حق کا انکار کیا تو آپ نے اپنی ہوی کی پیروی کی۔

ایک شخص نے آپ کے اوپر تنقید کی۔ اس سے آپ کی انا کو چوٹ لگی۔ آپ برہم ہو گئے۔ اس کے ساتھ رسول کی لائی ہوئی شریعت کا یہ حکم آپ کے سامنے آیا کہ متکبر نہ بنو، بلکہ متواضع بن کر لوگوں کے درمیان رہو۔ اب اگر آپ نے تنقید کے جواب میں تواضع کا انداز اختیار کیا تو آپ نے ماجاء بہ الرسول پر عمل کیا اور اگر آپ نے تنقید کے جواب میں گھمنڈ کا انداز اختیار کیا تو آپ نے ہوی کی پیروی کی۔

ایک شخص کے کسی رویہ سے آپ کو شکایت پیدا ہوئی۔ آپ مشتعل ہو گئے۔ اس وقت آپ کے سامنے شریعت کا یہ حکم آیا کہ لوگ اشتعال انگیزی کریں تب بھی تم صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ اب اگر آپ نے اشتعال کے باوجود صبر کیا تو آپ نے ماجاء بہ الرسول پر عمل کیا۔ اور اگر آپ مشتعل ہو کر فریقِ ثانی سے لڑنے لگے تو آپ نے ہوی کی پیروی کی۔

بہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ ہر معاملہ جو آدمی کے ساتھ پیش آتا ہے، اس میں اس کے لیے دو میں سے ایک رویہ اختیار کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ ایک رویہ اختیار کرنے کے بعد وہ خدا کے یہاں مومن لکھ دیا جاتا ہے، اور دوسرا رویہ اختیار کرنے کے بعد غیر مومن۔ (الرسالہ، نومبر 1991)

ضروری تیاری کے بغیر

کوئی انسان، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اس دنیا میں آتا ہے تو فطری طور پر اس کے لیے یہاں لامحدود امکان (unlimited potential) موجود ہوتا ہے۔ مگر دنیا کے فطری قانون کے مطابق، یہاں منصوبہ بندی اور ضروری تیاری کے بغیر کامیابی نہیں ملتی۔ کیوں کہ یہاں ہر چیز آپ کو پوٹنشل (potential) کی صورت میں ملتی ہے۔

آپ کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ آپ اس پوٹنشل کو دریافت کریں، اور پوٹنشل کو ذاتی عمل سے اپنے لیے ایکچول (actual) بنائیں۔ مثلاً درخت کا پھل آپ کو خود سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ آپ کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ زرخیز زمین (soil) میں ایک پودا لگائیں۔ صبر کے ساتھ اس کی نگہداشت کرتے ہوئے اس کو اگانا شروع کریں۔ اس طرح وہ وقت آتا ہے، جب کہ درخت ایک مکمل درخت بن جائے، اور اپنا پھل آپ کو دینا شروع کرے۔ اسی طرح انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اقدام سے پہلے گہرے مطالعے کے ذریعہ مواقع کو دریافت کرے اور پھر دانش مندانہ منصوبہ بندی کے ذریعے اس کو استعمال (avail) کرے۔

یہی فطری اصول فرد اور گروہ کی کامیابی کے لیے یکساں طور پر مطلوب ہے۔ انسان کے لیے اس دنیا میں موافق زمین (opportunity) کی کوئی کمی نہیں ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس کے لیے ضروری تیاری کی جائے۔ تیاری کے بغیر مواقع کو پانا ممکن نہیں۔ ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان صبر اور مثبت سوچ کی روش اختیار کرے۔ اس میں ادنیٰ درجے کا ڈسٹرکشن (distraction) انسان کو کامیابی سے دور کر دیتا ہے۔ وہ امکان کے قریب پہنچ کر بھی امکان سے دور ہو جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں یہی طریقہ اختیار فرمایا۔ اسی طریقے کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ کو ہر اعتبار سے غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس طریقے کو، دوسرے لفظوں میں حکیمانہ طریقہ کار کہا جاسکتا ہے۔

کامیاب شادی کارازاید جسٹمنٹ

یورپ کے ایک نوجوان ڈاکٹر سے گفتگو ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے یہاں تقریباً صدی صد لومیرتج ہوتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بیشتر شادیاں تفریق پر ختم ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد دونوں اکیلے زندگی گزارتے ہیں۔ انھوں نے مختلف وجہیں بیان کیں۔ مثلاً یہ کہ حقیقت میں وہ محبت نہیں ہوتی۔ بلکہ سطحی کشش سے قریب ہو کر دونوں شادی کر لیتے ہیں، وغیرہ۔

میں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ مرد فطری طور پر غلبہ کار جحان رکھتا ہے۔ شادی کے بعد ابتدائی کچھ دنوں تک اس کا یہ رجحان دبا رہتا ہے۔ مگر جلد ہی یہ رجحان ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اب شوہر چاہتا ہے کہ وہ گھر میں غالب ممبر کی حیثیت سے رہے۔ دوسری طرف عورت فیمنسٹ تحریکوں کے زیر اثر (نہ کہ فطرت کے زیر اثر) صنفی مساوات (gender equality) کے نظریہ کے مطابق رہنا چاہتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ٹکراؤ شروع ہوتا ہے جو بالآخر تفریق اور طلاق پر ختم ہوتا ہے۔ انھوں نے میرے نقطہ نظر سے کامل اتفاق کیا۔

پھر میں نے کہا کہ اس سلسلہ میں دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ شادی سے پہلے جب ایک نوجوان کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے تو ابتدائی تاثر کے تحت وہ سمجھتا ہے کہ یہ میرے لیے پرفیکٹ عورت ہے۔ مگر اس دنیا میں کوئی چیز پرفیکٹ نہیں۔ اور اسی طرح کوئی عورت یا مرد پرفیکٹ نہیں۔ جلد ہی مرد کے اوپر یہ حقیقت کھل جاتی ہے۔ اب وہ اپنی پسندیدہ خاتون کو کم تر سمجھ کر اس سے بے رغبت ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔

اس مسئلہ کا حل طلاق یا دوسرا نکاح نہیں ہے۔ بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ آپ یہ جانیں کہ اس دنیا میں کوئی بھی چیز آئیڈیل یا پرفیکٹ نہیں۔ یہاں ہر معاملہ میں ہمیں غیر آئیڈیل یا غیر پرفیکٹ کے ساتھ ایڈجسٹ کرتے ہوئے زندگی گزارنا ہے۔ گویا کامیاب ازواجی زندگی کارازاید جسٹمنٹ میں ہے، نہ کہ ناکام طور پر کامل پارٹنر کو تلاش کرنا، جو کبھی ملنے والا نہیں۔ انھوں نے میری اس بات سے بھی مکمل اتفاق کیا۔

صلحائے امت

صلحائے امت کے بارے میں جو حالات کتابوں میں ملتے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کے بارے میں وہ آخری حد تک بے رغبت ہو گئے تھے۔ دوسری طرف ان میں یہ صفت بھی تھی کہ وہ اپنے آپ کو دین کی اعلیٰ خدمت کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ گویا کہ ان کے اندر بیک وقت دو متضاد صفتیں پائی جاتی تھیں بی ایک طرف یہ کہ دنیا ان کے لیے ایک غیر مرغوب چیز بن گئی، اور دوسری طرف یہ کہ دین کی کسی اعلیٰ خدمت کے لیے اپنے آپ کو نااہل سمجھنا۔ امت میں اعلیٰ معیار کے جو صلحا پیدا ہوئے، ان میں یہ دونوں صفتیں اعلیٰ درجے میں موجود تھیں۔

اس مزاج کا خلاصہ ایک لفظ میں تواضع (modesty) ہے۔ تواضع کو کچھ لوگ انسان کی انفعالی صفت بتاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کچھ لوگ تو پست ہمتی کا درجہ دیتے ہیں۔ لیکن یہ ایک محمود صفت کو ایک نامحمود نام دینا ہے۔ تواضع آدمی کے اندر عقلی غور و فکر کی صفت پیدا کرتی ہے۔ تواضع آدمی کے اندر حقیقت پسندانہ سوچ (as it is thinking) پیدا کرتی ہے، اور بلاشبہ اس قسم کی سوچ آدمی کے لیے سب سے بڑا فکری سرمایہ ہے۔ ایسے ہی انسان کو مین کٹ ٹو سائز (man cut to size) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ متواضع آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے، اور مغرور آدمی ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔

انسان کی کامیابی کا ایک راز یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو فخر اور غرور کی نفسیات سے بچائے، وہ اپنے آپ کو ویسے ہی سمجھے جیسا کہ وہ باعتبار حقیقت ہے، ایسا آدمی ہمیشہ اپنے آپ کو حد کے اندر رکھتا ہے، وہ کبھی حد سے باہر نہیں جاتا۔ تواضع انسان کو ایک بہادر انسان بناتی ہے۔ تواضع آدمی کو اس سے بچاتی ہے کہ وہ بلا سوچے سمجھے اقدام کر ڈالے، اور پھر آخر میں ساری زندگی اس پر پچھتا رہے۔ تواضع ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے، حیوان تواضع کو نہیں جانتا۔ یہ صرف انسان ہے، جو تواضع کی حقیقت کو جانتا ہے، اور پھر اس کو شعوری طور پر اختیار کرتا ہے۔

غیر فطری اختلاف

مولانا محمد بدر عالم میرٹھی (وفات 1965) مشہور حنفی عالم تھے۔ ان کا ایک واقعہ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ایک روز فرمانے لگے کہ حنفی مسلک کا سب سے مشکل مسئلہ کون سا ہے جس کو ثابت کرنا حنفیوں کے لیے بڑا دشوار ہوتا ہے۔ ہم نے فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، اس طرح کے مسائل بتانے شروع کیے۔ فرمایا نہیں۔ حنفی مسلک کا سب سے مشکل مسئلہ وتر کا ہے۔ یہ فرما کر اپنے استاد حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کی عربی کتاب ”کشف الستور عن صلوة لوتر“ مجھے دی اور فرمایا کہ اس کا غور سے مطالعہ کر کے آنا (ماہ نامہ دارالعلوم، مارچ 2010، صفحہ 31)۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کے بعد کے زمانے میں، عباسی دور میں جو فقہ نبی، اس کی حقیقت کی تھی۔ اس زمانے میں بظاہر بہت سے فقہی اسکول قائم ہوئے، لیکن اصل حقیقت کے اعتبار سے سب کی نوعیت ایک تھی، تمام فقہا بظاہر اختلاف کے باوجود ایک ہی مشترک مہم میں مشغول تھے۔ اور وہ تھا، اسلام کا ایک ظاہری فارم بنانا۔ فقہا کی تمام تر توجہ اسلامی عمل کے ظاہری فارم پر تھی، نہ کہ اس کے داخلی اسپرٹ پر۔

اس غلط ترجیح کی بنا پر فقہا کی کوششیں غیر مفید ہو کر رہ گئیں۔ فارم میں فطری طور پر موضوع تنوع اور تعدد ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کا ایک مستند فارم بنانے کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ متعدد مذاہب فقہ قائم ہو گئے۔ اتحاد کی کوشش عملاً تفریق میں تبدیل ہو گئی۔ فقہا کے پاس کوئی خود دریافت کردہ عبادتی ڈھانچہ نہیں تھا، وہ یہی کر سکتے تھے کہ اصحاب رسول کی روایتوں سے عبادت کا طریقہ متعین کریں۔ بطور حقیقت اصحاب رسول کی عبادت کے طریقوں میں اختلاف تھا، ایسی حالت میں اگر فقہا تنوع کے اصول کو مان لیتے تو مسلک کا اختلاف اپنے آپ ختم ہو جاتا۔ اس کے برعکس، انہوں نے عبادت کا واحد مستند فارم بنانے کی کوشش کی، اس کا نتیجہ عملاً یہ نکلا کہ غیر ضروری طور پر مختلف فقہی مسالک قائم ہو گئے۔

شیخ محمد امین شنتقیطی (وفات 1974) مشہور عرب عالم تھے۔ ان کا ایک واقعہ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: شیخ شنتقیطی اکثر کہا کرتے تھے کہ ہمارے علما دینی بصیرت

کے ساتھ جب تک سائنسی علوم حاصل نہیں کریں گے، اور ہمارے نوجوان ان سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ اس وقت تک فکری غلبہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ اس وقت یورپ کے افکار دنیا میں چھائے ہوئے ہیں۔ اور ان کا جواب ان کی زبان میں دینا ہوگا۔ (ماہ نامہ دارالعلوم، مارچ 2010، صفحہ 35)

جدید مغربی افکار کے بارے میں مسلم علما کا عام ذہن یہی ہے۔ وہ ان کو اسلام پر مغرب کے فکری حملے کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ جس چیز کو اپنی ضرورت سمجھتے ہیں، وہ صرف یہ ہے کہ اہل اسلام کی طرف سے ان کا دفاعی جواب دیا جائے۔ یہ مغربی افکار کا صرف کمتر اندازہ ہے۔ مغربی افکار، دوسرے الفاظ میں سائنس کی زمین پر پیدا شدہ افکار کا نام ہیں، اور سائنس علوم فطرت کا دوسرا نام ہے۔ اس اعتبار سے، سائنس خود اسلام کے لیے ایک تائیدی علم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جدید طبعی سائنس اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اسلام کا جدید علم کلام ہے۔

اس معاملے میں مسلم علما کی یہ ہلاکت خیز غلطی ہے کہ وہ مغربی سائنس سے مغربی کلچر کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہ دیکھ سکے۔ اپنی عدم واقفیت کی بنا پر وہ دونوں کو ایک دوسرے کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ مغربی سائنس کا علم کتابوں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور انہوں نے یہ کتابیں پڑھی نہیں۔ اس کے برعکس، مغربی کلچر کا معاملہ یہ ہے کہ وہ کتابی مطالعے کے بغیر جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مغربی کلچر کو دیکھ کر یہ فرض کر لیا کہ یہی معاملہ مغربی سائنس کا بھی ہے۔ یہ مسئلہ ”جواب“ دینے کا نہیں ہے، بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ جدید سائنسی علم کو اسلام کے حق میں استعمال کیا جائے (حکمت اختلاف، صفحہ 90)۔

ترقی کا زینہ

ایک صاحب ایک عربی مدرسہ میں استاذ تھے۔ کچھ لوگ ان کے خلاف غصہ ہو گئے۔ انھوں نے ان کو اتنا زیادہ پریشان کیا کہ ان کو مدرسہ سے استعفیٰ دینا پڑا۔ وہ مجھ سے ملے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں یہ آپ کے لیے نئی ترقی کا زینہ ہے۔ باغبان کبھی ایک پودے کو اکھاڑتا ہے صرف اس لیے کہ اس کو دوبارہ کسی زیادہ بہتر جگہ پر نصب کیا

جائے۔ (ڈائری، 5 دسمبر 1996)

آج کی نوجوان نسلیں

موجودہ زمانے کے نوجوانوں کا مسئلہ صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ ان کے ذہن میں کچھ مثبت سوالات ہیں۔ مگر ہمارے رہنما ان سوالات کے جوابات منفی انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ ایک تضاد کی صورت حال ہے، اور یہی تضاد آج کے نوجوانوں کا اصل مسئلہ ہے۔ آج کا نوجوان بھٹکا ہوا نوجوان نہیں ہے، بلکہ وہ متلاشی (seeker) نوجوان ہے۔

بے لاگ تجزیہ بتاتا ہے کہ آج کل کے نوجوانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کے بزرگوں نے ان کو یہ بتایا کہ دور جدید ایک مخالف مذہب دور ہے۔ اس سوچ کے تحت ہمارے بزرگوں نے نوجوانوں کو یہ ٹارگٹ دیا کہ وہ دور جدید کو بدلیں۔ اس بنا پر ہماری کئی نسلیں خود ساختہ نظریے کے تحت دور جدید سے لڑتی رہیں۔ لیکن عملاً ان کو ناکامی کے سوا کچھ اور نہیں ملا۔

اس مسئلے کا حل صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ ہمارے بزرگ کھلے طور پر اعتراف کریں کہ ان کی نشاندہی غلط تھی۔ وہ اعلان کریں کہ دور جدید جو سائنس کی دریافتوں کے تحت بنا ہے، وہ ایک موافق مذہب دور تھا، لیکن ہمارے بزرگوں نے خلاف واقعہ طور پر اس کو مخالف مذہب دور کی حیثیت دے دی، اور ہماری جدید نسل نے بے فائدہ طور پر اس کے خلاف نظری یا عملی جنگ چھیڑ دی۔ اس کے نتیجے میں مایوسی کے سوا ان کو کچھ اور نہیں ملا۔

اب کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ آج کے نوجوانوں کو یہ بتایا جائے کہ جدید دور ایک موافق مذہب دور ہے۔ جدید تہذیب ایک موافق مذہب تہذیب ہے۔ جدید دور نے ہمارے لیے نئے مواقع کھول دیے ہیں، جن کو اوہیل کر کے ہم تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً قدیم دور تو روہات کا دور (age of superstitions) تھا، آج کا دور حقائق کا دور ہے۔ قدیم دور جبر کا دور تھا، آج کا دور آزادی کا دور ہے، وغیرہ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ہم نوجوانوں کو ایک امید بھرا نیا آغاز دے سکتے ہیں۔ (الرسالہ، مارچ 2020)

جمہوریت کا دور

مولانا محمد اکسنی مشہور عربی مجلہ البعث الاسلامی (ندوہ، لکھنؤ) کے بانی تھے۔ ان کا انتقال 44 سال کی عمر میں 1979 میں ہوا۔ ان کے انتقال پر مولانا محمد منظور نعمانی (وفات 1997) نے ایک مضمون شائع کیا تھا، اس مضمون کا ایک جزء یہ تھا: 11 جون 1979 کی شام کو ”البعث الاسلامی“ کا شمارہ میرے پاس آیا۔ مغرب اور عشاء کے درمیان میں نے سب سے پہلے اس کا افتتاحیہ پڑھا۔ جو عزیز مرحوم محمد اکسنی کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا: ”سَوَّأَلٌ حَائِزٌ يَحْتَأِجُ إِلَى جَوَابٍ“۔ یہ سات صفحے کا مضمون تھا۔ اس میں ممالک اسلامیہ عربیہ خاصہ کو سعودی مملکت کے ذمہ داروں سے وہ باتیں صاف صاف کہی گئی تھیں، جن کا اس طرح صاف صاف کہا جانا یہ ان کی خیر خواہی کا بھی تقاضا تھا، اور از روئے دین فرض ہو گیا تھا۔“ (ماہ نامہ الفرقان، لکھنؤ، مارچ 2013، صفحہ 8)

پچھلے دو سو سال کا زمانہ پریس کا زمانہ ہے۔ اس پوری مدت میں مسلم علما اور مسلم رہنماؤں نے احیائے ملت کے نام پر بے شمار تحریکیں چلائی ہیں، مگر ان تحریکوں کا خاص نشانہ زیادہ تر صرف ایک تھا، اور وہ تھا، حکمرانوں کو خطاب کر کے ان کی ذمہ داریاں یاد دلانا۔ سید جمال الدین افغانی (وفات 1897) سے لے کر اکیسویں صدی کے مسلم قائدین تک تقریباً سب لوگ اس اسلوب کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ مگر دو سو سال سے زیادہ مدت کی پر جوش جدوجہد کے باوجود یہ تحریکیں مکمل طور پر ناکام ہیں۔ اس ناکامی کا سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے۔ دورِ جمہوریت میں دورِ بادشاہت کے اسلوب پر کام کرنا۔

قدیم زمانے میں حکمرانوں کو خطاب کیا جاتا تھا، مگر موجودہ جمہوری زمانے میں کام کا نتیجہ خیز طریقہ صرف ایک ہے اور وہ ہے عوام کے اندر ذہنی بیداری لانا۔ مسلم قائدین جس طریق کار پر قائم ہیں۔ وہ ایک قسم کی خلافِ زمانہ روش ہے۔ اور فطرت کے قانون کے مطابق، اس قسم کی روش کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔

موجودہ زمانہ ایک نیاز زمانہ تھا۔ اس وقت موثر کام کرنے کے لیے ضروری تھا کہ زمانی حالات کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کیا جائے، یہ سمجھا جائے کہ جدید تقاضے کیا ہیں، اور پھر انہی کے مطابق

اسلامی کام کی منصوبہ بندی کی جائے۔ مگر عملاً یہ ہوا کہ لوگوں نے پرجوش تقریر و تحریر کو کافی سمجھ لیا۔ یہ بلاشبہ ایک غلط اندازہ تھا۔ اس غلطی کا نتیجہ تھا کہ موجودہ زمانے میں بے شمار قرائنیوں کے باوجود مطلوب نشانہ حاصل نہ ہو سکا۔

کامیابی بھی ناکامی ہو سکتی ہے!

امریکہ کے ایک ناشر نے جب اپنی پہلی کتاب چھاپی تو وہ ایک مہینہ میں پانچ لاکھ کی تعداد میں فروخت ہو گئی۔ بظاہر یہ ایک نہایت شاندار کامیابی تھی۔ مگر دوسرے ہی مہینہ وہ ناشر دیوالیہ ہو گیا۔ اس کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ اس نے کتاب کی لاگت کا کم اندازہ لگایا۔ چنانچہ اس نے جو قیمت مقرر کی اس پر اس کو آٹھ سنڈ فی نسخہ نقصان ہو رہا تھا۔ اگر کتاب کم بکتی تو وہ گھاٹے سے بچ سکتا تھا۔ مگر جب اس کو اپنی غلطی کا علم ہوا تو نقصان کی مقدار اس کی برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اتنی زبردست کامیابی کے باوجود اس کا کاروبار ختم ہو گیا۔

یہی حال تمام اجتماعی اقدامات کا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک نعرہ کسی وجہ سے لوگوں کو اپیل کر جائے اور بہت سے لوگ اس کے ساتھ چل پڑیں۔ لیکن اگر اس میں دور اندیشی اور حقیقت پسندی نہیں ہے، اگر اقدام کے وقت حالات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا ہے۔ تو عین ممکن ہے کہ نعرہ اور اس کے ساتھ دینے والے سارے لوگ ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہو جائیں۔

آخرت کے پہلو سے بھی اس کے اندر نصیحت موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دینی کام کافی پھیل جائے۔ لاکھوں لوگ اس حلقہ میں شامل ہو جائیں۔ اس کے رہنماؤں کو اعزاز اور قدر و منزلت حاصل ہو جائے۔ لیکن اگر اس کے پیچھے صحیح اسلامی جذبہ نہیں ہے تو آخرت کے اعتبار سے اس کا وہی انجام ہوگا جو امریکی ناشر کا ہوا۔ (ہفت روزہ الجمعیتہ، 20 دسمبر 1967، صفحہ 10)

ذہین لوگوں کا قبرستان

تاریخ ذہین لوگوں کا قبرستان ہے۔ یہ بات اتنی زیادہ عام ہے کہ مشکل ہی سے اس میں کسی کا استثناء (exception) معلوم کیا جاسکتا ہے۔ ایک عرب شیخ نے کہا تھا: السُّعُودِيَّةُ مَقْبَرَةٌ لِغُلَمَاءِ الْمُسْلِمِينَ (سعودی عرب مسلم علما کا مقبرہ ہے)۔ یہی بات عمومی طور پر اس طرح کہی جاسکتی ہے: التَّارِيخُ مَقْبَرَةٌ لِلْأَذْكِيَاءِ (تاریخ، ذہین لوگوں کا قبرستان ہے)۔

یہ معاملہ ان لوگوں کا ہے، جن کو خالق نے ذہین (brilliant) انسان کی حیثیت سے پیدا کیا، یعنی اعلیٰ ذہن والا انسان۔ یہ لوگ گویا کہ خالق کی امید (hope) تھے۔ اپنی اعلیٰ صلاحیت کی وجہ سے وہ بڑے بڑے کام کر سکتے تھے۔ ان کے اندر یہ صلاحیت تھی کہ وہ پوری تاریخ کو ایک نیا رخ دے سکیں۔ وہ ایک نئی برتر تہذیب پیدا کر سکیں۔ لیکن ان اعلیٰ صلاحیت کے لوگوں میں سے تقریباً ہر ایک کا حال یہ ہوا کہ وہ اپنے فطری امکانات (potential) کو واقعہ (actual) نہ بنا سکا۔ ایک محدود مدت کے بعد وہ مر کر اس دنیا سے چلا گیا۔ اس قسم کے غیر معمولی افراد کی مثالیں ماضی میں بھی تھیں اور آج بھی موجود ہیں۔

غیر معمولی ذہانت رکھنے والوں کی اس ناکامی کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ جو آدمی غیر معمولی صلاحیت کے ساتھ پیدا ہوا، اس نے فوراً ہی تواضع (modesty) کھودی۔ وہ ایک مغرور (arrogant) انسان بن گیا۔ اس تاریخی المیہ کا واحد سبب یہی ہے۔ اس دنیا میں کسی انسان کی سب سے بڑی مثبت صفت تواضع ہے، اور سب سے بڑی منفی صفت غرور (arrogance)۔ یہی واحد سبب ہے، جس کی بنا پر اعلیٰ صلاحیت کے لوگ صرف ناکامی کی تاریخ بنا سکے، کامیابی کی تاریخ بنانا، ان سے ممکن نہ ہو سکا۔ فطرت کے قانون کے مطابق، اس دنیا میں تواضع کامیابی کی ضامن ہے اور غرور کسی آدمی کو ناکامی کے سوا کہیں اور نہیں پہنچاتا۔

ہر چیز ایک پروفیشن

ایک مذہبی مسلمان نے ایک دکان کھولی۔ دکان کامیاب نہ ہو سکی۔ انہوں نے دکان بند کر دی اور ایک مدرسہ کھول لیا۔ مدرسہ کامیابی کے ساتھ چلنے لگا۔ جو فائدہ انہیں دکان سے حاصل نہیں ہو سکا تھا، وہ فائدہ ان کو مدرسے سے حاصل ہو گیا۔ ایک مسلمان نے ڈاکٹری شروع کی۔ ڈاکٹری میں وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اسلامی ادارہ بنایا اور اس ادارے کے اسٹیج سے انہوں نے اسلامی تقریروں کا پروگرام شروع کر دیا۔ اب وہ خوب کامیاب ہو گئے۔ جلد ہی مسلمانوں کے درمیان ان کی دھوم مچ گئی۔ ایک مسلمان عرصے تک بے کار تھے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک مسجد کی بنیاد رکھ دی۔ ایک عرصے کے بعد مسجد کی شاندار عمارت کھڑی ہو گئی۔ مسجد کے ذریعے انہیں وہ سب کچھ حاصل ہو گیا جس کو وہ چاہتے تھے۔

اسی کا نام دینی پروفیشن ہے، یعنی دین کو ایک پروفیشن کے طور پر اختیار کرنا۔ دین کے نام پر وہ فائدے حاصل کرنا جس کو لوگ مادی پیشے کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں یہ دینی پروفیشن بہت زیادہ عام ہو چکا ہے۔ ہر آدمی کسی نہ کسی عنوان سے، دین کو ایک تجارت بنائے ہوئے ہے۔ ہر آدمی دین کے نام پر وہ تمام مادی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو دوسرے لوگ دنیا کے نام پر حاصل کرتے ہیں۔

ایک چیز ہے مشن (mission) اور دوسری چیز ہے پروفیشن (profession)۔ ایک شخص دین کو مشن کے طور پر اختیار کرے، یعنی خالص رضائے الہی کے لیے وہ دین کے کسی شعبے کی خدمت کرے، تو اس کا یہ عمل اس کے لیے آخرت میں جنت میں داخلے کا ذریعہ بنے گا۔ اس کے برعکس، جو لوگ دین کو بطور پروفیشن اختیار کریں، یعنی دین کے نام پر مادی فائدہ حاصل کریں، ان کو دنیا کی زندگی میں کچھ ظاہری فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن آخرت میں وہ اس قرآنی آیت کے مصداق ٹھہریں گے: **أُولَئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ** (3:77)۔ یعنی، آخرت کی اعلیٰ نعمتوں میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔

سیکھنے کی اہمیت

ایک مسلم نوجوان نے عربی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں داخلہ لیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ مدرسہ میں پڑھے ہوئے نوجوانوں سے ملتے ہیں، لیکن جو نوجوان انگریزی اسکولوں میں پڑھ کر آتے ہیں اور انگریزی بولتے ہیں ان سے وہ دور رہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے ان لوگوں کی طرح اچھی انگریزی بولنا نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ یہ کوئی عذر نہیں۔ اگر آپ کو اچھی انگریزی بولنا نہیں آتا تو آپ کو سیکھنا تو آتا ہے۔ آپ بات کرنے کے لیے نہیں، بلکہ سیکھنے کے لیے ان کے پاس بیٹھے۔ انہوں نے ایک سال ایسا کیا۔ اس کے بعد انہیں دوسروں کی طرح انگریزی میں بات کرنا آ گیا۔

اکثر لوگ اپنے بارے میں اس قسم کی کمتری کی نفسیات میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ اپنے حال (present) کو جانتے ہیں، مگر وہ اپنے مستقبل (future) کو دریافت نہیں کر پاتے۔ یہ کمزوری اکثر لوگوں میں غیر شعوری طور پر ہوتی ہے۔ وہ اپنی اس کمزوری کو دریافت نہیں کر پاتے، وہ جانے بغیر اس میں مبتلا رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر فطری طور پر اعلیٰ امکانات موجود رہتے ہیں، لیکن بے شعوری کی بنا پر وہ ان امکانات کو واقعہ نہیں بنا پاتا۔ یہاں تک کہ وہ اسی حال میں مر جاتا ہے۔

سیکھنا (learning) ہر انسان کے لیے بہت ضروری ہے۔ سیکھنے کا فائدہ سب سے زیادہ ان لوگوں کے ذریعے ملتا ہے جو آپ کے جاننے والے ہوں۔ البتہ اس کے لیے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی کے اندر تواضع (modesty) کا مزاج ہو۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ تواضع علم کا دروازہ ہے:

Modesty is the door of knowledge.

تواضع کے ذریعے آدمی علم کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ جس آدمی کے اندر تواضع کی صفت نہ ہو، وہ دوسروں سے فائدہ نہیں اٹھائے گا، وہ علم کے کتب خانے کے اندر بھی علم سے محروم رہے گا۔

علم کا اٹھ جانا

صحیحین میں ایک روایت آئی ہے۔ بخاری کے الفاظ یہ ہیں۔ حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يُرْفَعَ الْعِلْمُ، وَيُنْبِتَ الْجَهْلُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 80)۔ یعنی، قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ قیامت سے پہلے علم اٹھ جائے گا اور جہالت پھیل جائے گی۔

اس حدیث رسول میں علم سے مراد حکمت ہے۔ علم کے دو پہلو ہیں۔ ایک ہے، معلومات (information)، اور دوسری چیز ہے، حکمت (wisdom)۔ اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علم بمعنی معلومات اٹھ جائے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر علم تو موجود ہوگا، لیکن اہل علم حکمت و بصیرت سے محروم ہو جائیں گے۔ قرآن بتاتے ہیں کہ موجودہ زمانہ قرب قیامت کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے میں وہ واقعہ عملاً پیش آچکا ہے، جس کی پیشین گوئی مذکورہ حدیث رسول میں کی گئی تھی۔ جہاں تک علم بمعنی معلومات کا تعلق ہے، موجودہ زمانے میں اس اعتبار سے، بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ موجودہ زمانے میں ایک کمپیوٹر کے اندر اس سے زیادہ علمی ذخیرہ موجود ہوتا ہے، جو اس سے پہلے کسی بڑے کتب خانے میں پایا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں سب سے بڑا محدث گوگل (Google) ہے۔ کیوں کہ ایک سوچ دبانے سے گوگل کا سرچ انجن آپ کے سامنے اتنی زیادہ حدیثیں پیش کر دیتا ہے، جو اس سے پہلے کسی بڑے سے بڑے محدث کے دماغ میں بھی نہیں ہوتی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث رسول میں رفع علم سے مراد رفع حکمت ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قیامت سے پہلے دنیا میں غیر معمولی مادی ترقیاں ہوں گی۔ لوگ مادیات میں اتنا زیادہ مشغول ہو جائیں گے کہ ان کے پاس حکمت و بصیرت جیسی چیزوں پر غور کرنے کے لیے وقت ہی نہ ہوگا۔ لوگوں کے پاس معلومات تو ہوں گی، لیکن حکمت و بصیرت کے اعتبار سے وہ ذہنی بوناپن (intellectual dwarfism) کا شکار ہو جائیں گے۔ لوگ صاحب معلومات تو ہوں گے، لیکن وہ صاحب بصیرت نہ ہوں گے۔

مخالفت یا غلط فہمی

برطانیہ کی کرشچن مشنری کے ایک ممبر کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ قرآن کا مطالعہ کر کے ایسی چیزیں جمع کریں جن کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جاسکے۔ اس منصوبے کے مطابق، انہوں نے قرآن کے انگریزی ترجمے کا مطالعہ شروع کر دیا۔ کچھ دنوں کے مطالعے کے بعد وہ قرآن سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے مسیحی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ قبول اسلام کے بعد ان کا نام یہ رکھا گیا: داؤد بربانک (Dawud Burbank)۔ اس کے بعد انہوں نے عربی زبان اور دینی تعلیم کے حصول کے لیے 1980 میں جامعہ اسلامیہ (مدینہ) میں داخلہ لیا۔ فراغت کے بعد انہوں نے پچاس 50 سے زیادہ عربی کتابوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ قبول اسلام کے بعد انہوں نے پاکستان کی ایک مسلم خاتون سے شادی کر لی۔ وہ دونوں حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔ یکم نومبر 2011 کو مکہ جاتے ہوئے ایک روڈ حادثے میں ان دونوں کا انتقال ہو گیا۔ بوقت وفات ان کی عمر 49 سال تھی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر مخالفت کا سبب صرف ایک ہوتا ہے، اور وہ غلط فہمی (misunderstanding) ہے۔ درست طرز عمل یہ ہے کہ کسی کو محض ظاہری مخالفت کی بنا پر دشمن قرار نہ دیا جائے اور نہ اسے اپنے سے الگ سمجھا جائے۔ بلکہ ان کے کیس کو غلط فہمی کا کیس سمجھا جائے، اور سنجیدہ انداز میں ان کو اسلام کا مطالعہ کرایا جائے۔ اس کے بعد وہی ہوگا جس کی خیر قرآن میں ان الفاظ میں دی گئی ہے: بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں۔ تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو، پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس شخص میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا (41:34)۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ بعد کو مختلف اسباب سے اس کی رائے کسی کے بارے میں منفی اور کسی کے بارے میں مثبت بن جاتی ہے۔ یہ رائے اکثر حقیقت پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ وہ غلط فہمی پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر آدمی کو مطالعے کا موقع دیا جائے تو عین ممکن ہے کہ وہ معطلے کی صحیح نوعیت کو سمجھ جائے اور اپنی غلط سوچ کی اصلاح کر لے۔

عصری اسلوب میں اسلامی دعوت

عصری اسلوب میں اسلامی دعوت کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو ایسے اسلوب میں پیش کیا جائے جو عصری ذہن کو ایڈریس کرنے والا ہو۔ یہ اسلوب کلام کو بدلنے کی بات ہے، نہ کہ خود پیغام کو بدلنے کی بات۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قرآن کی سورہ البلد میں یہ آیت آئی ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (90:4)۔ اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ہم نے پیدا کیا ہے انسان کو مشقت میں۔ آج کے ذہن کے لیے مشقت کا لفظ ایک منفی لفظ ہے۔ آج کا ذہن چیزوں کو مثبت اصطلاح (positive term) میں سمجھنا چاہتا ہے۔ آج کے ذہن کے لیے مذکورہ آیت کو زیادہ قابل فہم بنانے کی صورت یہ ہے کہ مشقت کے لفظ کے معنوی پہلو کو نمایاں کیا جائے، اور یہ کہا جائے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے انسان کو چیلنج کے حالات میں پیدا کیا ہے:

We have created man in a world of challenges.

اسلام کی تعلیمات کو عصری اسلوب میں پیش کرنا بلاشبہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ مگر یہ کوئی پراسرار بات نہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کامل طور پر غیر متعصبانہ انداز میں جدید ذہن کا مطالعہ کیا جائے اور پھر اسلام کی تعلیمات کو ایسے الفاظ اور ایسی اصطلاحوں میں بیان کیا جائے جو آج کے ذہن کو ایڈریس کرنے والا ہو۔

اس کام کو کرنے کے لیے پہلی شرط ہے جدید انسان کے بارے میں منفی سوچ کا کامل خاتمہ۔ اس شرط کو پورا کیے بغیر کوئی شخص ہرگز یہ خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ اس شرط کو پورا کیے بغیر جو شخص یہ کام کرے، وہ جدید ذہن کی نمائندگی بھی غلط کرے گا اور اس کی نسبت سے اسلام کی تشریح بھی غلط۔ منفی سوچ کیا ہے، اس کی ایک مثال اکبر الہ آبادی (وفات 1922) کے یہ اشعار ہیں:

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے شاہ ایڈورڈ کی دہائی ہے

امر بالمعروف، نہی عن المنکر

معروف کا حکم کرنا اور منکر سے روکنا اسلامی شریعت کی ایک اہم تعلیم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلم خاندان یا مسلم معاشرے میں محاسبہ (introspection) کی روح ہمیشہ زندہ رہے۔ ایک مومن دوسرے مومن کا سچا ناصح بنا ہوا ہو۔ مومنانہ کردار کی ادائیگی میں جب بھی کوئی شخص کوتاہی کرے تو اس کا ساتھی یا اس کا پڑوسی یا اس کا ہم صحبت پوری خیر خواہی کے ساتھ اس کو نصیحت کرے۔ حدیث کے الفاظ میں ہر مومن دوسرے مومن کا آئینہ بن جائے — الْمُؤْمِنُ مِرَاةُ الْمُؤْمِنِ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 4918)۔ جس طرح آئینہ اپنے دیکھنے والے کو کسی کا مپلکس (complex) کے بغیر ٹھیک ٹھیک نشان دہی کرتا ہے، اسی طرح ہر مومن دوسرے مومن کے لیے آئینے جیسا کردار ادا کرتا ہے۔

موجودہ زمانے میں کچھ لوگوں نے معروف و منکر کی تعلیم میں بطور خود جا معیت کا تصور شامل کر کے اسلام کی اس مثبت تعلیم کو منفی رخ دے دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ معروف و منکر کی تعلیم کا تعلق صرف انفرادی زندگی سے نہیں، بلکہ وہ اجتماعی زندگی تک محیط ہے۔ اس تعلیم کا تقاضا ہے کہ اہل ایمان معروف و منکر کی تعلیم کو پوری اجتماعی زندگی میں نافذ کریں، اس راہ میں جو سیاسی یا غیر سیاسی رکاوٹ ہو، اس سے لڑ کر اس کو راستے سے ہٹادیں۔

معروف و منکر کا یہ جامع تصور بلاشبہ ایک خود ساختہ تصور ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اسلام کی اصل تعلیم سے یقینی طور پر ایک انحراف ہے۔ مسلم دنیا میں نظام عدل کی اقامت کے نام پر اس وقت جو تشدد و کلچر جاری ہے، وہ براہ راست طور پر اس انحراف کا نتیجہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا اصل نشانہ فرد (individual) ہے، نہ کہ نظام (system)۔ قرآن و حدیث میں جہاں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تعلیم آئی ہے، وہاں اس سے مراد فرد کی اصلاح ہے، نہ کہ سماجی اور سیاسی نظام (socio-political system) میں کسی قسم کے قانون کا بزور نفاذ۔

ناکامی کا مثبت پہلو

مشہور سائنس داں سر آئزک نیوٹن (وفات 1727) ایک غریب فیملی میں پیدا ہوا۔ ابتدائی عمر میں اس کی ماں نے اس کو خاندانی کام میں لگا دیا، یعنی کھیتی کرنا اور مویشی پالنا۔ لیکن نیوٹن اس کام کے لیے اہل ثابت نہ ہوا، وہ اس میں بری طرح ناکام ہو گیا۔ اس ناکامی کے بعد نیوٹن کو ایک اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ تعلیم کے اس نئے میدان میں وہ کامیاب رہا اور ترقی کرتے کرتے آخر کار اعلیٰ درجے کا سائنس داں (scientist) بن گیا۔

کاشٹکاری کے پیشے میں نیوٹن کی ناکامی اس بات کا اشارہ تھی کہ فطرت نے نیوٹن کو کسی اور کام کے لیے پیدا کیا ہے، یعنی نیوٹن کو پیدا کرنے والے نے اس کو کاشٹکاری کے لیے نہیں، بلکہ سائنس کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس واقعے میں ہر آدمی کے لیے ایک سبق ہے۔ اگر تم ایک میدان میں ناکام ہو جاؤ تو مایوس نہ ہو، بلکہ اپنے لیے دوسرے میدان کار کو دریافت کرو۔ اپنی ابتدائی ناکامی کو اس بات کا ذریعہ بناؤ کہ تم اپنے لیے زیادہ بہتر میدان عمل کا انتخاب کر سکو۔

ہر انسان جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ ہمیشہ اعلیٰ صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے اندر چھپی ہوئی مخصوص صلاحیت کو دریافت نہیں کر پاتا۔ وہ بے خبری میں کوئی ایسا کام شروع کر دیتا ہے، جس کے لیے اس کے خالق نے اس کو پیدا نہیں کیا تھا۔ اس قسم کے افراد اکثر اپنی زندگی میں ناکامی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ ناکامی سادہ طور پر صرف ناکامی (failure) نہیں ہوتی، بلکہ وہ فطرت کی خاموش زبان میں ایک نئے پیغام کے ہم معنی ہوتی ہے۔ جو انسان اپنی ناکامی کو دیکھ کر مایوس ہو جائے، وہ فطرت کے اشارے کو دریافت نہ کر سکے گا۔ لیکن جو شخص اپنی ناکامی کو ایک مثبت تجربہ (positive experience) سمجھے اور دوبارہ غور و فکر کرے تو وہ یقینی طور پر اپنے لیے ایک نیا اور بہتر چوائس (better choice) دریافت کرے گا اور اس کے مطابق عمل کر کے کامیابی کی منزل تک پہنچ جائے گا۔

پیغام

(مدرسہ باب العلوم، کولکاتا، کے سالانہ مجملہ کے لیے ان کی فرمائش پر مولانا وحید الدین خاں صاحب نے زیر نظر پیغام روانہ کیا تھا)۔

زندگی ایک امتحان ہے۔ یہ اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اور اسی حقیقت کو سمجھنے میں ہماری تمام کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے، خواہ وہ دنیا کی کامیابی ہو یا آخرت کی کامیابی۔ آخرت کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو دنیا میں جو کچھ ملا ہوا ہے وہ بطور آزمائش ہے، نہ کہ بطور استحقاق۔ آدمی کو چاہیے کہ اس کو وہ اپنی ذاتی چیز نہ سمجھے، بلکہ اس کو خدا کی چیز سمجھے۔ یہ چیزیں صرف اس وقت تک آدمی کے قبضہ میں ہیں جب تک اس کی مدت امتحان پوری نہ ہو۔ مدت پوری ہوتے ہی سب کچھ اس سے چھین لیا جائے گا۔ اس کے بعد آدمی کے پاس جو کچھ بچے گا وہ صرف اس کے اپنے اعمال ہوں گے، نہ کہ وہ ساز و سامان جن کے درمیان آج وہ اپنے آپ کو پاتا ہے۔

دنیا کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جس طرح ایک شخص کو آزادی حاصل ہے اسی طرح یہاں دوسرے شخص کو بھی پوری آزادی حاصل ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے یہ دنیا اس چیز کا ایک میدان بن گئی ہے جس کو مقابلہ (competition) کہا جاتا ہے۔ یہاں ہر آدمی آزاد ہے، اس لیے یہاں ہر ایک شخص اور دوسرے شخص یا ہر ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان کھلا مقابلہ جاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہر کامیابی دوسروں کے بالمقابل اپنے آپ کو کامیاب بنانے کا نام ہے۔ یہاں وہی شخص جیتتا ہے جو زندگی کی دوڑ میں دوسروں سے بازی لے جائے۔ یہاں اسی شخص کو ملتا ہے جو دوسروں سے آگے بڑھ کر لے لینے کا حوصلہ کر سکے۔

جن لوگوں کے پاس غیر اللہ کے سہارے ہوں وہ آخرت کی دنیا میں اپنے آپ کو بے قیمت پائیں گے۔ اسی طرح جو لوگ صرف تعصب اور امتیاز کی اصطلاحوں میں سوچنا جانتے ہوں وہ موجودہ دنیا میں بے جگہ ہو کر رہ جائیں گے، وہ مقابلہ کی اس دنیا میں اپنے لیے کوئی حقیقی مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ (الرسالہ، نومبر 1985)

اسلام کا نیا دور

(مدرسہ مصباح العلوم، آسنسول، کی فرمائش پر مولانا وحید الدین خاں نے زیر نظر ”پیغام“ روانہ کیا تھا)

چودھویں صدی ہجری پر اسلام کا ایک دور ختم ہوا ہے، پندرہویں صدی ہجری میں اسلام کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج وہ تمام موافق حالات مکمل طور پر پیدا ہو چکے ہیں جو اسلام کا نیا دور شروع کرنے کے لیے درکار ہیں۔

جب رات کا اندھیرا ختم ہوتا ہے اور نئے دن کا سورج نکلنے کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، تو یہ فطرت کی طرف سے اس بات کا خاموش اعلان ہوتا ہے کہ روز و شب کی ایک گردش پوری ہو گئی۔ اب اس کی دوسری گردش شروع ہونے والی ہے۔ جو شخص چاہے اس کی روشنی میں اپنا سفر شروع کرے اور منزل پر پہنچ جائے۔

صبح کے وقت سورج کا نکلنا ہر آدمی کو دو چیزوں کے درمیان کھڑا کر دیتا ہے۔ ایک وہ موقع جو گزر چکا۔ دوسرا وہ موقع جو سامنے کھلا ہوا موجود ہے۔ جو شخص بھی ان مواقع کو استعمال کرے گا، وہ لازماً اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔ تاہم امتحان کی اس دنیا میں مواقع صرف انھیں کے لیے ہوتے ہیں، جو مواقع کو استعمال کریں۔ جو لوگ مواقع کو استعمال کرنے میں ناکام رہیں، ان کے لیے کوئی موقع موقع نہیں۔ کامیابی دوسرے لفظوں میں موجود مواقع کو استعمال کرنے ہی کا دوسرا نام ہے۔

کوئی شخص پچھلے کل میں اپنا سفر شروع نہیں کر سکتا۔ سفر جب بھی شروع ہوگا آج سے شروع ہوگا، نہ کہ گزرے ہوئے ”کل“ سے۔ جو لوگ آج کے دن بھی گزرے ہوئے کل میں جنیں ان کے لیے اس دنیا میں بربادی کے سوا اور کوئی چیز مقدر نہیں۔ جو مواقع گزر چکے انھیں بھول جائیے۔ جو مواقع آج موجود ہیں ان کو جاننے اور انہیں استعمال کیجیے، ان شاء اللہ، آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔ یاد رکھیے، گزرا ہوا دن کبھی کسی کے لیے واپس نہیں آیا۔ گزرا ہوا دن آپ کے لیے بھی

واپس آنے والا نہیں۔ (الرسالہ، جون 1985)

علماء کم، خطباز زیادہ

مشہور صحابی رسول حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: اِنَّكُمْ فِي زَمَانٍ: كَثِيْرٌ فُقَهَاؤُهُ، قَلِيْلٌ خُطَبَاؤُهُ.... وَسَيَاْتِي مِنْ بَعْدِكُمْ زَمَانٌ: قَلِيْلٌ فُقَهَاؤُهُ، كَثِيْرٌ خُطَبَاؤُهُ (الادب المفرد للبخاری، اثر نمبر 789)۔ یعنی، آج تم ایک ایسے زمانے میں ہو، جب کہ امت میں علماء بہت ہیں اور خطبائے کم ہیں۔ تمہارے بعد ایک ایسا زمانہ آئے گا، جب کہ امت میں خطباز زیادہ ہوں گے اور علماء کم ہوں گے۔

اس قول میں علماء (اور بعض روایت کے مطابق فقہاء) سے مراد حقیقی اہل علم ہیں، اور خطبائے مراد عوامی انداز میں بولنے والے مقررین ہیں۔ بعد کے زمانے سے مراد اسٹیج اور میڈیا کا زمانہ ہے۔

یہ بعد کا زمانہ آج پوری طرح ہمارے سامنے آچکا ہے۔ قدیم زمانے میں، جب کہ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا وجود میں نہیں آیا تھا اور نہ جدید قسم کا اسٹیج بنا تھا، اُس وقت تقریر و خطابت میں کوئی کشش موجود نہ تھی۔ اُس وقت کے حالات میں لوگ زیادہ تر علمی مطالعہ اور علمی کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ اس بنا پر قدیم زمانے میں یہ ممکن تھا کہ بڑے بڑے اہل علم پیدا ہوں۔

موجودہ زمانے میں، اسٹیج اور میڈیا کے ظہور نے صورتِ حال کو بالکل بدل دیا ہے۔ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ آدمی پُر جوش تقریریں کر کے اسٹیج پر نمایاں ہو۔ اخباروں میں اس کی تصویریں چھپیں۔ ٹی وی کے پروگراموں میں اس کا شاندار مظاہرہ ہو، وغیرہ۔

اس طرح کی چیزوں نے آج کے ذہین لوگوں کو علم سے بے رغبت کر دیا ہے۔ اسٹیج اور میڈیا میں نمایاں ہونا، اُن کے لیے زیادہ پرکشش بن گیا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو صحابی رسول نے پیشین گوئی کے انداز میں بیان کیا۔

علم والا آدمی سوچ کر بولتا ہے اور خطابت والا آدمی سوچے سمجھے بغیر اپنی تقریر شروع کر دیتا ہے۔ اس فرق کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ علم والا آدمی مُصلِح کا درجہ پاتا ہے، اور خطابت والا آدمی مُفسد کا درجہ۔ مستقبل کی تعمیر کے لیے ہمیشہ صاحب بصیرت اہل علم درکار ہوتے ہیں، نہ کہ اہل خطابت۔ (الرسالہ، فروری 2009)

علماء کا مقام

علماء کے بارے میں ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: **إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ، إِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوْرَثُوا دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا إِنَّمَا وَرَثُوا الْعِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَ بِهِ أَخَذَ بِحِطِّ وَافِرٍ** (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2682؛ سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 3641)۔ یعنی، بیشک علماء انبیاء کے وارث ہیں، انبیاء نے دینار و درہم کی وراثت نہیں چھوڑی، بیشک انھوں نے علم کی وراثت چھوڑی ہے، پس جس نے اس کو لیا، اس نے بڑا حصہ پایا۔

اس حدیث میں علماء سے مراد سنیافتہ علماء نہیں ہیں۔ بلکہ وہ افراد ہیں، جو حقیقی معنوں میں اہل علم کا درجہ رکھتے ہوں۔ جن کو معرفت کے درجے میں ایمان حاصل ہوا ہو، اور پھر کثرت مطالعہ کے ذریعے وہ اس درجے تک پہنچے ہوں، جس کو ایک مشہور قول میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **یک من علم را، ده من عقل می باید (یک من علم کے لیے دس من عقل چاہیے)**۔ یعنی صاحب معرفت و بصیرت انسان۔ اس معنی میں جو لوگ اہل علم ہیں، وہ اپنے علم و معرفت کی بنا پر اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ دین کا صحیح فہم حاصل کریں، اور دین کو ہر زمانے میں مطلوب انداز میں دنیا کے سامنے پیش کریں۔

اس حدیث میں عالم سے مراد پروفیشنل عالم نہیں ہے، بلکہ عالم سے مراد صاحب معرفت عالم ہے۔ یہ وہ علماء ہیں، جن کو ان کے علم دین نے اس آیت قرآن کا مصداق بنا دیا ہو: **وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (2: 165)**۔ یعنی، جو ایمان لائے، وہ اللہ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے ہیں۔ اس سے مراد وہ اہل علم ہیں، جن کے علم نے ان کا یہ حال کر دیا ہو کہ اللہ رب العالمین ان کا سب سے بڑا کنسرن بن گیا ہو۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں، جو صرف صاحب معلومات نہ ہوں، بلکہ گہرے معنی میں صاحب بصیرت بن چکے ہوں۔ اس سے مراد وہ عالم ہیں، جو لکھنے اور بولنے سے پہلے سجدے میں گر کر اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں: **يَا مُعَلِّمَ إِبْرَاهِيمَ عَلَّمْنِي (اعلام الموقعین لابن القیم، جلد 4، صفحہ 198)**۔ یعنی، اے ابراہیم کو علم عطا کرنے والے، مجھے علم عطا فرما۔ (الرسالہ، اکتوبر 2018)

سبق آموز

فتح پور سیکری شہنشاہ اکبر (1605-1543) کا دارالسلطنت تھا۔ یہ آگرہ سے 45 کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں دوسری بہت سی عمارتوں کے ساتھ ایک شاہی ”عبادت خانہ“ بھی تھا۔ یہ عبادت خانہ اکبر کے بعد زمین کے نیچے دب گیا اور اس کے اوپر گھاس اور درخت اگ آئے۔ حال میں حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مشترک منصوبہ کے تحت اس کی کھدائی کی گئی ہے اور اس کو باہر نکالا گیا ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا 8 جون 1984)

اس عبادت خانہ میں شہنشاہ اکبر علما کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ اور ان سے مذہب کے موضوعات پر گفتگو کرتا تھا۔ یہیں اس نے اپنا مشہور ”دین الہی“ وضع کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندستان میں مختلف مذاہب کے ماننے والے بستے ہیں۔ اس لیے کسی ایک مذہب کی بنیاد پر یہاں سیاسی استحکام حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

اس نے یہ رائے قائم کی کہ اس ملک میں مغل سلطنت کی بنیاد اس وقت تک مضبوط نہیں ہو سکتی جب تک یہاں کے لوگوں کا مذہب ایک نہ ہو جائے۔ تبلیغ کے ذریعہ مذہب کو بدلنا اس کو مشکل نظر آیا۔ چنانچہ اس نے ایک نیا مذہب، دین الہی ایجاد کیا۔ جس میں بزعم خود اس نے تمام مذاہب کی خصوصیات جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ نیا مذہب اپنی مشترک خصوصیات کی بنا پر ملک کے تمام باشندوں کے لیے قابل قبول ہو جائے گا۔

دین الہی کی تشکیل کے دوران اس کو عیسائی مذہب کے بارے میں جاننے کی ضرورت پیش آئی۔ اس نے پرتگال کے عیسائی بادشاہ کو خط لکھا کہ اس کو انجیل کے فارسی ترجمے کی ضرورت ہے۔ شاہ پرتگال نے یہ فارسی ترجمہ بھیج دیا۔ تاہم اس کا مطالعہ اکبر کے لیے کافی نہ ہو سکا۔ اس کے بعد اکبر نے روم کے پوپ کو لکھا کہ مسیحیت کی تعلیم کے لیے اس کے پاس معلم بھیجے جائیں۔ پوپ نے فوراً دو تربیت یافتہ افراد ہندستان روانہ کر دیے۔

ایک فادرا کو او یوا (Fr. Rodolfo Acquaviva) اور دو سرافادر مانسریٹ (Fr. Anthony Monserrate)۔ یہ دونوں صاحبان 28 فروری 1590ء کو فتح پور سیکری پہنچے۔ ”اکبر نامہ“ کی ایک پینٹنگ میں اکبران عیسائی معلمین سے محو گفتگو نظر آتا ہے۔

اکبر نے ان دونوں عیسائی معلمین کو شاہی عبادت خانہ کے پاس ”خوشبو خانہ“ میں ٹھہرایا۔ مگر یہ دونوں مسیحی صرف ”معلم“ نہ تھے۔ بلکہ وہ اپنے مذہب کے تربیت یافتہ مبلغ تھے۔ چنانچہ انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ خوشبو خانہ کو گر جا گھر میں تبدیل کر دیا۔ یہ شمالی ہند کا پہلا گر جا گھر تھا جو اکبر کے زمانے میں قائم ہوا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ فادرا کو او یوانے پوپ کو جو رپورٹ بھیجی تھی، اس میں اس نے لکھا کہ میرا احساس یہ ہے کہ اکبر ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہو رہا ہے کہ وہ مسیحیت کو قبول کر لے۔ مگر اس سے اکبر کا اصل مقصد (سلطنت کا استحکام) حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اکبر ایسے اقدام سے باز رہا۔ اس واقعہ میں دو بڑے سبق ہیں۔ ایک سبق یہ کہ دولت اور اقتدار کا حصول اکثر عقل سے محرومی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ کسی آدمی کو جب دولت اور اقتدار مل جاتا ہے تو اکثر اس کو وہ ایسے کاموں میں ضائع کرتا ہے جس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ شہنشاہ اکبر نے سیاسی خوش خیالی کے تحت ”دین الہی“ وضع کیا تھا۔ اس پر اس نے سلطنت کے بے پناہ وسائل خرچ کیے۔ حالاں کہ اس کا انجام بالآخر یہ ہونا تھا کہ وہ تاریخ کے ملبہ کے نیچے دب کر رہ جائے اور آثار قدیمہ کے طالب علموں کے سوا کسی اور کو اس سے دل چسپی نہ رہے۔

دوسرا سبق دعوتی ہے۔ اکبر نے پوپ سے مسیحی معلم مانگے اور اس نے فوراً دو تیار شدہ افراد اس کے پاس بھیج دیے۔ جب کہ مسلمانوں سے جدید دور میں بار بار یہی تقاضا کیا گیا ہے، مگر وہ اس تقاضے کو کبھی پورا نہ کر سکے۔ مسیحی ادارے اپنی مشنری اسپرٹ کی وجہ سے سیکڑوں سال سے اس پوزیشن میں ہیں کہ مشرق و مغرب میں اپنے تربیت یافتہ افراد بھیج سکیں۔ جب کہ مشنری اسپرٹ سے محروم ہو کر مسلمانوں کا یہ حال ہو رہا ہے کہ ان کے پاس نہ مشرقی ضرورت کے مطابق خدا کے دین کے مبلغ موجود ہیں اور نہ مغربی ضرورت کے مطابق۔

دور جدید میں مسلمانوں کی بربادی کا واحد سبب سے بڑا سبب یہی ہے۔ مسلمانوں کی حیثیت خدا کے گواہ کی ہے (البقرہ، 2:143؛ الحج، 22:78)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی عملی سرگرمیوں کا اصل نشانہ صرف ایک ہے اور وہ دعوت ہے۔ جن لوگوں کی نظریں اس نشانہ پر جمی ہوئی ہوں وہ اپنے لیے عمل کا صحیح میدان پالیں گے اور جب نظریں اس نشانہ سے ہٹ جائیں تو تمام قوتیں منتشر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ ایک ایسی قوم بن جاتے ہیں جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ وہ ایسا گروہ بن جاتے ہیں جس کا کوئی اقدام نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے۔ (الرسالہ، اگست 1984)

تربیتِ شعور

مسٹر خالد جمال ملاقات کے لیے آئے۔ وہ حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ اس وقت وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کارپوریٹ کمیونی کیشنز کے مینجر ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ میری ابتدائی تعلیم کلکتہ کے ایک اردو اسکول میں ہوئی۔ میرے باپ بھی معمولی حیثیت کے آدمی تھے۔ بظاہر میرے لیے کسی بڑی ترقی کے مواقع نہیں تھے۔ مگر میں اپنی طالب علمی کے زمانہ سے ہی الرسالہ پڑھتا تھا۔ اس سے میرے اندر ایک نئی سوچ اور نئی ہمت پیدا ہو رہی تھی۔ پھر میں نے الرسالہ میں ایک مضمون پڑھا، جس میں بتایا گیا تھا کہ یہ ایچ آف کمیونی کیشن ہے۔ اس کو پڑھ کر میرے اندر یہ عزم جاگا کہ مجھے کمیونی کیشن کا کورس کرنا چاہیے۔ چنانچہ اردو اسکول سے فراغت کے بعد میں نے کمیونی کیشن کی اسٹڈی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ آج میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کمیونی کیشن کے شعبہ کا مینجر ہوں۔ اکثر لوگ اردو اسکول اور عربی مدرسہ کے خلاف لکھتے اور بولتے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ قوم کونا کارہ بناتا ہے۔ مگر مذکورہ مثال بتاتی ہے کہ یہ رائے درست نہیں۔ اصل کام یہ ہے کہ اردو اسکول یا عربی کے ساتھ ”الرسالہ“ جیسے کسی انفارمل تربیتی کورس کا اضافہ کر دیا جائے۔ اس کے بعد ہر طالب علم اس طرح آگے بڑھ جائے گا جس طرح خالد جمال صاحب آگے بڑھ گئے۔ (ڈائری، یکم دسمبر 1995)

ٹیم کے ذریعے مدد

حضرت موسیٰ قدیم مصر میں پیغمبر تھے۔ ان کو جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بنایا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ میں تنہا یہ کام نہیں کر سکتا، اس لیے میرے بھائی ہارون کو اس کام میں میرا مددگار بنا دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی کمی کی تلافی کے لیے ان کو مددگار کے طور پر ایک ٹیم دے دی گئی۔ اس ٹیم میں پہلے صرف حضرت ہارون تھے۔ اس کے بعد اس میں اور بہت سے لوگ شامل ہو گئے۔ مثلاً دار فرعون کا راجل مومن حبیب بن شمعون، فرعون کی بیوی آسیہ، مصر کے جادوگر، اور اسی طرح بنی اسرائیل کے بہت سے لوگ۔

یہ اللہ کی نصرت کا ایک طریقہ ہے۔ قرآن میں یہ واقعہ صرف تاریخ کے طور پر ذکر نہیں ہوا ہے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے قانون نصرت کے طور پر بیان ہوا ہے۔ اللہ کی نصرت کبھی وقتی نہیں ہوتی، وہ ہمیشہ کے لیے ہوتی ہے۔ آج بھی اگر اللہ تعالیٰ کا ایک بندہ اللہ کے کام کے لیے اٹھے، وہ اپنے آپ کو خالص اللہ کے کام میں پوری طرح لگا دے، پھر وہ اللہ سے کہے کہ خدایا، میں ایک کمزور انسان ہوں۔ دین کی خدمت جیسے عظیم کار کو انجام دینے کی صلاحیت میرے اندر نہیں۔ تو اپنی خصوصی نصرت سے میری کمزوری کی تلافی فرما۔ اگر اللہ کا ایک بندہ حقیقی طور پر اللہ سے یہ درخواست کرے تو یقینی طور پر اللہ اس کی درخواست کو قبول فرمائے گا اور دوبارہ اس کو ایک ایسی طاقتور ٹیم دے دے گا جو اس کی ذاتی کمیوں کی تلافی کرنے والی ہو۔

اعلیٰ صلاحیت کے لوگ ہمیشہ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ لیکن وہ اپنی ذاتی عظمت (personal glory) کے لیے کام کرتے ہیں، خدا کی عظمت کے لیے کام کرنے کا جذبہ ان کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے کام کے لیے اکثر ایسے لوگ اٹھتے ہیں جو ہمالیائی شخصیت کے حامل نہ ہوں، لیکن اللہ ان کی خصوصی مدد کرتا ہے۔ ایک طرف وہ ان کو اعلیٰ بصیرت کا سرمایہ دے دیتا ہے، اور دوسری طرف وہ ان کو قابل کار افراد کی ایسی ٹیم دے دیتا ہے، جو اپنی متحدہ کوشش سے سارا کام انجام دیتے ہیں۔

علم اور تقویٰ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور وہ تم کو علم دے گا (2:282)۔ سورۃ الانفال میں کہا گیا ہے کہ اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تم کو فرقان عطا فرمائے گا (8:29)۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے کہ اللہ سے ڈرو... وہ تم کو روشنی عطا فرمائے گا جس میں تم چلو گے (57:28)۔

امام مالک نے امام شافعی سے ان کی جوانی کی عمر میں نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا: اِنِّي اَرَى اللّٰهَ قَدْ اَلْقَى عَلَيَّ قَلْبِكَ نُورًا، فَلَا تُطْفِئُهُ بِظُلْمَةِ الْمَعْصِيَةِ (الجواب الكافي لابن القيم، صفحہ 52)۔ یعنی، میں دیکھتا ہوں کہ اللہ نے تمہارے دل کو روشنی سے بھر دیا ہے تو تم اس کو گناہ کی تاریکی سے نہ بجھاؤ۔ امام شافعی نے اپنے استاد و کعب بن الجراح سے اپنی ایک گفتگو کا ذکر اس طرح اشعار میں کیا ہے:

شَكُوْتُ اِلَى وَكَيْعٍ سُوءٍ حِفْظِي فَاَرشَدَنِي اِلَى تَرْكِ الْمَعاصِي
وَاخْبَرَنِي بِاَنَّ الْعِلْمَ نُورٌ وَنُورُ اللّٰهِ لَا يَهْدِي لِعَاصِي

میں نے اپنے استاد و کعب سے حافظ کی خرابی کی شکایت کی تو انھوں نے مجھے نصیحت کی کہ گناہوں کو چھوڑ دو اور انھوں نے مجھے بتایا کہ علم روشنی ہے اور اللہ کی روشنی کسی گناہگار کو راستہ نہیں دکھاتی۔

یہاں علم سے مراد معلومات نہیں، معرفت ہے۔ ایک حقیقی معرفت تک پہنچنے کے لیے صرف یہ کافی نہیں کہ آدمی کے پاس الفاظ اور معلومات کا ذخیرہ ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اندر صحت فکر ہو۔ اللہ کا ڈر آدمی کے اندر یہی صحت فکر پیدا کرتا ہے۔ آدمی جتنا زیادہ سنجیدہ ہو اتنا ہی زیادہ اس کے اندر صحت فکر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ اللہ کا ڈر آدمی کو سب سے زیادہ سنجیدہ بناتا ہے، اس لیے اللہ کا ڈر آدمی کو سب سے زیادہ اس قابل بناتا ہے کہ وہ صحیح اور درست طریقہ پر سوچ سکے۔

اللہ کا ڈر آدمی کے الفاظ اور معلومات کے لیے ایسا ہی ہے جیسے سانچہ خام اشیا کے لیے۔ سانچہ خام اشیا کو با معنی صورت میں تبدیل کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ کا ڈر الفاظ اور معلومات کو معرفت میں ڈھال دیتا ہے بی کچھ علوم انسانی مدرسہ میں پڑھائے جاتے ہیں اور کچھ علوم خدا کے مدرسہ میں۔ (الرسالہ، اکتوبر 1984)

سائنٹفک مزاج

سائنٹفک مزاج (scientific temper) علمی اعتبار سے کسی انسان کی سب سے بڑی صفت ہے۔ سائنٹفک مزاج اس بات کا ضامن ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے قول یا اپنے عمل میں کوئی ایسی روش اختیار نہ کرے جو حقیقت واقعہ کے خلاف ہو۔ کسی انسان کے اندر سائنٹفک مزاج اس وقت بنتا ہے جب کہ آدمی کے اندر کامل معنوں میں موضوعیت (objectivity) پائی جائے۔ وہ اس قابل ہو جائے کہ وہ اپنے ذاتی رجحان سے الگ ہو کر چیزوں کو غیر جانبدارانہ انداز میں دیکھے اور ایذا (as it is) انداز میں اپنی رائے قائم کرے۔

سائنٹفک اپروچ (scientific approach) اور سائنٹفک ٹمپر دونوں قریبی الفاظ ہیں۔ لیکن دونوں میں ایک فرق پایا جاتا ہے۔ سائنٹفک اپروچ ایک تکنیکل اصطلاح ہے۔ جب کہ سائنٹفک ٹمپر آدمی کے نفسیاتی مزاج کو بتاتا ہے۔ سائنٹفک اپروچ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی معلوم سائنسی طریقہ (scientific method) کو اپنائے، وہ مہتدولوجی (methodology) کے اعتبار سے سائنسی اصولوں کی پیروی کرے۔ اس کے مقابلے میں سائنٹفک ٹمپر کا مطلب یہ ہے کہ یہی آدمی کی نفسیات بن جائے۔

سائنٹفک ٹمپر ایک بے حد مشکل چیز ہے۔ اکثر بڑے بڑے لوگوں میں بھی سائنٹفک ٹمپر نہیں ہوتا۔ اس کی ایک مثال اسٹیفن ہاکنگ (1942-2018) ہے۔ وہ ایک ماہر نظریاتی سائنسدان کی حیثیت سے معروف ہے۔ لیکن اس نے ایک ایسا بیان دیا جو سائنٹفک ٹمپر سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ایک انٹرویو کے دوران اس نے کہا کہ جنت یا زندگی بعد موت کا کوئی وجود نہیں، یہ سب پریوں کی کہانی ہے:

There is no heaven or afterlife, that is a fairy story.

ایک آدمی جس کے اندر سائنٹفک ٹمپر ہو وہ ایسی بات کہنے کا تحمل نہیں کر سکتا۔ ایک سائنسدان جائز طور پر صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ جنت جیسی کوئی چیز اب تک اس کے مشاہدے میں نہیں۔ مگر یہ بات کہنا کہ جنت جیسی کوئی چیز امر واقعہ کے طور پر موجود نہیں، خالص علمی اعتبار سے ایسا کہنے کا حق کسی کو نہیں، نہ سائنس داں کو اور نہ غیر سائنسدان کو۔

اسی طرح مشہور سائنس داں البرٹ آئن سٹائن نے یہودی فلسفی ایرک
 (Eric B. Gutkind, 1877-1965) کو ایک خط (3 جنوری 1954) لکھا تھا، جو علمی دنیا
 میں گاڈ لیٹر (God letter) کے نام سے معروف ہے۔ اس خط میں آئن سٹائن نے لکھا کہ خدا کا
 لفظ اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ وہ صرف انسانی کمزوریوں کی ایک پیداوار ہے:

The word God was nothing more than the expression
 and product of human weaknesses.

یہ خود اگرچہ ایک معروف سائنس داں کا قول ہے۔ مگر وہ سائنٹفک ٹمپر کے مطابق نہیں۔
 ایک مسئلے کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بتاتے ہوئے، یہ ایک ایسا بیان دینا ہے جو اپنی نوعیت
 کے اعتبار سے ایک سبجیکٹیو بیان (subjective statement) ہے۔ یہ بات ایک
 سائنس داں کے حیثیتِ عرفی کے خلاف ہے۔ کیوں کہ سائنس داں اپنے علمی موقف کے مطابق،
 صرف آبیجیکٹیو بیان (objective statement) کو درست (valid) سمجھتا ہے، نہ کہ سبجیکٹیو
 بیان (subjective statement) کو۔

ڈاکٹر اے وی ہلز (Archibald Vivian Hill, 1886-1977) نے کہا ہے کہ میں
 آخری شخص ہوں گا جو اس بات کا دعویٰ کرے کہ ہم سائنس داں دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں کے مقابلے میں
 کم تعصب رکھنے والے ہوتے ہیں:

I should be the last to claim that we, scientific men, are
 less liable to prejudice than other educate men.

ایک سائنسی عالم کا مذکورہ قول بالکل درست ہے۔ اس کلیہ میں سائنس دانوں کا بھی کوئی استثنا
 نہیں۔ سائنسی مزاج کسی آدمی کا سب سے بڑا ذہنی سرمایہ (intellectual asset) ہے۔ ایسا
 آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ چیزوں کے بارے میں مبنی برحقیقت رائے قائم کرے، وہ جانبدارانہ
 سوچ سے آخری حد تک خالی ہو، وہ چیزوں کو اپنے ذاتی رجحان کی روشنی میں نہ دیکھے، بلکہ اس طرح
 دیکھے جیسے کہ وہ حقیقتاً ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کا ایک واقعہ

5 مارچ 2000 کو ہندوستانی وزیر خارجہ مسٹر جسونت سنگھ کا ٹیلی فون آیا۔ انہوں نے کہا کہ ایک مسئلہ میں آپ سے بات کرنا ہے۔ اس کے لیے میں وزارت خارجہ کے جوائنٹ سکریٹری مسٹر وو یک کاٹجو کو آپ کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد وہ 5 مارچ کی شام کو ہمارے دفتر میں آئے اور دیر تک گفتگو کی۔

مسٹر وو یک کاٹجو نے کہا کہ ہائی جیکنگ کے معاملہ میں میں جسونت سنگھ کے ساتھ افغانستان (قندھار) گیا تھا۔ وہاں ہماری ملاقات افغانی نوجوانوں سے ہوئی۔ انہوں نے اپنے آپ کو دیوبندی بتایا۔ ہم نے پوچھا کہ آپ لوگ برائے سیاحت ہندستان آنا پسند کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ پھر ہم نے پوچھا کہ آپ ہندوستان میں کون سی جگہیں دیکھنا چاہیں گے۔ انہوں نے سب سے پہلے دیوبند کا نام لیا۔ مسٹر وو یک کاٹجو نے کہا کہ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ طالبان تحریک اور ہائی جیکنگ کا تعلق کیا دیوبند کے مدرسہ سے ہے۔

میں نے کہا کہ ایسا ہرگز نہیں۔ ان لوگوں کا یہ کہنا کہ ہم دیوبندی ہیں، صرف فقہی معنی میں ہے، اور اس معنی میں میں بھی دیوبندی ہوں۔ اس کا کوئی تعلق طالبان کی سیاسی تحریک سے نہیں ہے۔ پھر میں نے کہا کہ افغانستان میں بڑے بڑے دینی مدرسے نہیں ہیں۔ چنانچہ آزادی سے پہلے افغانستان کے طلبہ دارالعلوم دیوبند میں آکر دینی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ آزادی کے بعد جب حالات بدل گئے تو دیوبند کے پڑھے ہوئے علمائے بلوچستان میں افغانستانی سرحد کے قریب بہت سے مدرسے قائم کیے۔ یہ مدرسے نصاب کے اعتبار سے دیوبندی پیٹرن پر تھے۔ اس لیے ان مدرسوں کو بھی دیوبندی مدرسہ کہا جانے لگا۔ دیوبندی مدرسہ کا مطلب حنفی فقہ کی تعلیم کا مدرسہ ہے جیسا کہ دیوبند کا یہ مدرسہ ہے۔ میں نے کھل کر وضاحت کی کہ افغانی طالبان کا سیاسی نظریہ پاکستان کے سیاسی لیڈروں کا بنا ہوا ہے، نہ کہ دیوبندی مدرسہ کا دیا ہوا۔ مسٹر وو یک کاٹجو میری باتوں کو سن کر مطمئن ہو گئے اور دیوبند کے بارے میں ان کے شبہات ختم ہو گئے۔ (ڈائری، 6 مارچ 2000)

جانا ہے بہت دور

ایک بزرگ نے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ شروع شروع میں اس تعلیم گاہ کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اساتذہ کو وقت پر تنخواہیں نہ ملنے سے طلباء کے لیے بعض اوقات کھانے کا انتظام ناممکن ہو جاتا۔ چھپیر کے سایہ کے نیچے تعلیم دی جاتی اس طرح کی بے شمار دشواریوں کے درمیان اس درس گاہ کو سفر کرنا پڑا۔

مگر دشواریاں جس طرح آدمی سے کچھ چیزیں چھینتی ہیں، اسی طرح وہ اسے کچھ چیزیں دیتی بھی ہیں۔ ظاہری اسباب کی کمی عزم و ہمت کو بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ ایسے جذبات اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں جو فراوانی کے اندر کبھی پیدا نہیں ہوتے۔

اس تعلیمی ادارے کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے ایک روز سارے ادارے میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ حالات بے حد نامساعد نظر آ رہے تھے۔ درس گاہ کے ناظم نے طلباء و اساتذہ کا ایک اجتماع کیا جب وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلا:

”موجودہ حالات میں ممکن ہے آپ کا جی ملامت کرتا ہو کہ آپ کہاں آ کر پھنس گئے۔ کسی بنی بنائی درس گاہ میں گئے ہوتے تو آرام سے رہ سکتے تھے۔ مگر یہ گھبرانے کی بات نہیں، کیونکہ دوسرے اگر حال کے وارث ہیں تو یہاں آپ ایک نئے مستقبل کی تعمیر کر رہے ہیں۔ لوگ تاریخ خواں ہوتے ہیں مگر آپ کو قدرت نے ایک ایسے مقام پر کھڑا کیا ہے کہ آپ تاریخ ساز بن سکتے ہیں۔“

یہ الفاظ جن حالات میں کہے گئے تھے اس کے اعتبار سے وہاں اس نے بجلی کا کام کیا۔ طلبہ اور اساتذہ میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ وہ زندگی کی ایک اعلیٰ ترین اخلاقی قدر سے آشنا ہوئے۔ یہ کہ مستقبل کی تعمیر کے لیے حال میں جدوجہد کی جائے۔ یہ قدر، نفسیاتی طور پر، اس وقت ان کے لیے لامعلوم رہتی جب کہ وہ ایسے حالات میں نہ ہوتے۔ اسی طرح ناظم درس گاہ کی زبان سے بھی ہرگز یہ الفاظ نہ نکلتے اگر وہ آسودگی اور فارغ البالی میں ہوتے۔ ناظم اس لیے یہ الفاظ بول سکے اور سننے والے اسی لیے ان کو سمجھ سکے کہ وہ دشوار حالات میں تھے۔ آسانیوں کی فضا میں انھیں یہ سبق نہیں مل سکتا تھا۔

جو لوگ اپنے آپ کو مشکل حالات میں پائیں وہ اسے اپنی بدقسمتی تصور کرتے ہیں حالانکہ یہ صرف سمجھنے کی غلطی ہے اگر صحیح ذہن ہو اور عزم بیدار ہو تو مشکل حالات اس سے زیادہ بڑی چیزیں دیتے ہیں۔ جو آسانیوں اور راحتوں میں کسی کو ملتی ہے۔ دشواریاں آپ کو اعلیٰ ترین انسانی قدروں سے آشنا کرتی ہیں۔ آپ کے اندر سوز و درد پیدا کر کے آپ کے کلام کو بے پناہ بنا دیتی ہیں مشکلات کو عبور کرنے کا نیا ولولہ پیدا کرتی ہیں اور بالآخر آپ کو ان بلند ترین انسانوں میں شامل کرتی ہیں جن کو تاریخ خواں کے مقابلے میں تاریخ ساز کہا جاتا ہے۔

اوپر جس واقعہ کا حوالہ دیا گیا، وہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا واقعہ ہے اور جس نے مذکورہ تقریر کی، وہ مولانا مجیب اللہ ندوی (1918-2006) تھے۔ اب خدا کے فضل سے یہ ادارہ ”چھپر“ کے دور سے نکل کر ”بلڈنگ“ کے دور میں داخل ہو گیا ہے اور تعلیم کے میدان میں ملت کو ایک نئی راہ دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ ہر بار جب کوئی شخص نیا کام شروع کرتا ہے، تو اس راستہ میں غیر یقینی صورت حال سے لازماً دوچار ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ صبر اور امید کے ساتھ جمار ہے تو استحکام کے مرحلہ پر پہنچنے سے کوئی بھی اسے روک نہیں سکتا۔ (الرسالہ، اپریل 1977)

اسلام کی خدمت

جامعہ دارالسلام کے چار طلبہ ملاقات کے لیے آئے۔ ایک صاحب نے کہا کہ میں صحافت کے ذریعہ اسلام کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اسلام کی خدمت کسی صحافت یا غیر صحافت کے ذریعہ نہیں ہوتی، اسلام کی خدمت صبر اور محنت کے ذریعہ ہوتی ہیں۔ اگر آپ اپنے اندر صبر اور محنت کی صفت پیدا کر لیں تو آپ جہاں بھی رہیں گے آپ کامیاب طور پر اسلام کی خدمت کر سکیں گے۔ اور اگر صبر اور محنت کی صفت آپ کے اندر نہیں ہے تو کہیں بھی آپ اسلام کی مفید خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ (ڈائری، 14 اگست 1996)

مدرسہ کلچر

مدرسہ کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہاں دینی تعلیم ہوتی ہے، مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مدرسہ مبنی بر اقدار تعلیم (value education) کا ادارہ ہے۔ مدرسہ دراصل اُن قدیم روایات کے تسلسل کا نام ہے، جب کہ تعلیم کا مطلب اخلاقی تعلیم (moral education) ہوتا تھا، جب کہ انسانی اقدار (human values) کو نصابِ تعلیم کا اہم جز سمجھا جاتا تھا۔

جدید نظامِ تعلیم کے برعکس، مدرسہ میں صرف سبکٹ پڑھانے کے بجائے کتابوں کے ذریعے مختلف موضوعات کو پڑھایا جاتا ہے۔ اس طرح ان مدرسوں میں ابھی تک قدیم کتابوں کی اہمیت باقی ہے۔ قدیم روایات کے مطابق، یہ تمام کتابیں انسانی اقدار اور اخلاقی اصولوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس طرح مدارسِ تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت کے ادارے بن گئے ہیں۔ ان مدارس میں سماج کے اچھے شہری تیار کیے جاتے ہیں۔

مدارس کے ماحول میں ہمیشہ خدا اور مذہب اور روحانیت کا چرچا رہتا ہے۔ اس طرح یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ مدارس میں تربیت پا کر جو لوگ تیار ہوں، وہ تعمیری سوچ کے حامل ہوں۔ وہ اجتماعی ذمے داریوں کو سمجھیں۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ (accountable) سمجھیں۔ وہ اپنی ذات میں جینے والے نہ ہوں، بلکہ وہ دوسرے انسانوں کا شعور بھی یکساں طور پر رکھتے ہوں۔

مدرسے کے تعلیمی نظام میں مسلسل طور پر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بات دہرائی جاتی ہے۔ یہ دونوں تصور مدرسہ کے پورے نظامِ تعلیم میں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر شامل ہیں۔ اس طرح ہر مدرسہ گویا کہ ایک ایسا ادارہ بن جاتا ہے، جو فنی تعلیم کے ساتھ انسانی اور اخلاقی کلچر کا مرکز ہو۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ موجودہ زمانے میں قدیم اخلاقی روایات کا تسلسل جن اداروں کے ذریعے قائم ہے، وہ یہی مدرسے ہیں۔ یہ مدرسے قدیم اخلاقی چراغ کو موجودہ زمانے میں بھی جلائے ہوئے ہیں۔

(الرسالہ، جون 2008)

دینی مدارس

ایک صاحب جو خود دینی مدرسہ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ دینی مدارس میں علم نبوت تو ہے، مگر وہاں نور نبوت نہیں۔ میں نے کہا کہ کوئی دینی مدرسہ آپ کو صرف علم دین دے سکتا ہے۔ وہ چیز جس کو آپ نور نبوت کہتے ہیں، وہ معرفت کی چیز ہے۔ اور معرفت ایک ایسا علم ہے جو خود اپنی دریافت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ کوئی نصاب یا کوئی دینی ادارہ آپ کو معرفت نہیں دے سکتا۔

میں نے کہا کہ موجودہ دینی مدارس کی اصل کمی وہ نہیں ہے جو آپ سمجھتے ہیں۔ بلکہ اصل کمی یہ ہے کہ ان مدارس میں کھلا پن (openness) موجود نہیں ہے۔ اس بنا پر طلبہ کے اندر تخلیقی فکر (creative thinking) اور معرفت یا آپ کے الفاظ میں نور نبوت پیدا نہیں ہوتی۔ معرفت تخلیقی فکر کا نتیجہ ہے۔ بند ماحول میں کبھی وہ چیز نہیں پیدا ہو سکتی جس کو معرفت کہا جاتا ہے۔

مدرسے کے نصاب کے ذریعے ایک طالب علم متون (texts) کو پڑھتا ہے۔ مگر کھلا پن (openness) طالب علم کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ نصاب کی کتابوں کے باہر جو علمی ذخیرہ ہے، اس سے بھی فائدہ اٹھائے۔ وہ اپنے اندر علمی گہرائی پیدا کرے۔ وہ وسعت نظر کا حامل بنے۔ وہ اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرے کہ مدرسے کی حدود سے باہر جو وسیع تر دنیا ہے، اس سے واقفیت حاصل کرے۔ وہ کتابوں کے دائرے سے باہر انسانوں کے دائرے میں داخل ہو جائے۔

یہ ضروری ہے کہ طالب علم اپنے موضوع کے متون سے واقف ہو۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور بڑی ضرورت ہے، وہ یہ کہ طالب علم اپنے زمانے کو جانے۔ وہ زندگی کے وسیع تر دائرے سے باخبر ہو۔ یہ چیز صرف خارجی مطالعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ خارجی مطالعہ سے مراد صرف کتابی مطالعہ نہیں ہے، بلکہ دیگر اہل علم سے تبادلہ خیال کے ذریعے اپنے ذہنی افق کو وسیع کرنا بھی اس میں شامل ہے۔ یعنی دینی موضوعات کے علاوہ سیکولر موضوعات سے بقدر ضرورت آشنا ہونا۔ (الرسالہ، اگست 2016)

ذہنی جمود کا نقصان

ہندستان کے دینی مدارس کے معلم یقیناً ایک اہم خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یہ ایسی نسل کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں، جس سے دینی روایت کا تسلسل قائم ہے۔ اسی طرح یہ مدارس آزاد ہندستان میں اردو کوزندہ رکھنے کا ایک بڑا ذریعہ ہیں، وغیرہ۔

مگر ہندستان کے دینی مدرسوں میں جو ماحول ہے وہ معلمین کے فکری مستوی کو بلند نہیں ہونے دیتا۔ مثال کے طور پر ان مدارس میں استاد اور شاگرد کا رشتہ صرف معلم اور معلم (مستعلم) کا رشتہ ہے۔ یعنی ایک بتانے والا ہے اور دوسرا سننے والا۔ اس کی وجہ سے معلمین کا مزاج ایسا بن جاتا ہے کہ وہ اپنے ذہن سے باہر کی حقیقتوں کو سمجھ نہیں پاتے۔ طلبہ کے سامنے ان کی حیثیت یہ ہوتی ہے کہ انھیں سیکھنا نہیں ہے، بلکہ سکھانا ہے۔ اس سے ان کا ذہن جمود (stagnation) کا شکار ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ جاننا یا دوسروں کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرنا، یہ سب باتیں ان کے مزاج سے خارج ہو جاتی ہیں۔

اس کے برعکس مغرب میں تعلیم کا تصور بالکل دوسرا ہے۔ مغرب میں استاد اور شاگرد کے درمیان معلم اور معلم کا تعلق نہیں، بلکہ رفیق کا تعلق ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم ایک مشترک سفر ہے، جس کو استاد اور شاگرد دونوں مل کر انجام دیتے ہیں۔ اس طرح کے ماحول میں انسان کا ذہن یہ بنتا ہے کہ اس کو اگر کچھ دینا ہے، تو اس کو دوسرے سے کچھ لینا بھی ہے۔ وہ اگر کچھ باتیں جانتا ہے تو دوسرے بھی کچھ باتوں کو جانتے ہیں جن کو اسے دوسرے سے لینا چاہیے۔

مغرب کے تعلیمی نظام میں معلم کے اندر ذہنی جمود پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے اندر یہ صلاحیت زندہ رہتی ہے کہ وہ اپنے سے باہر کی حقیقتوں کو سمجھے، اور ان سے فائدہ اٹھائے۔ اس کے برعکس، ہمارے دینی مدارس کا ماحول، مذکورہ سبب سے، جامد ذہنیت پیدا کرنے کا کارخانہ بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مدارس کے ذریعہ تحفظ دین کا کام تو کسی درجہ میں ہوا، مگر احیائے دین کا کام ان مدارس کے ذریعہ مطلق نہ ہو سکا۔ (اوراق حکمت، ڈائری، 26 مارچ 1985)

دو دنیاؤں کا فرق

میں نے اپنی تحریری زندگی شروع کی تو میں کمیونزم کا مخالف بن چکا تھا۔ اسی زمانہ میں میں نے اس کے بارے میں ایک مقالہ لکھا تھا جو ”ہندستان کی منزل: سوشلزم یا اسلام“ کے نام سے چھپا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس موضوع پر زیادہ جامع کتاب لکھی جو اپریل 1959 میں شائع ہوئی۔ اس کا نام تھا: مارکسزم جس کو تاریخ رد کر چکی ہے۔ اس کے جلد ہی بعد اس موضوع پر میری دوسری کتاب اگست 1959 میں شائع ہوئی۔ اس کا نام تھا: سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ۔

پچھلے 35 سال کے اندر اس موضوع پر میں کم از کم ایک سو مضامین اور کتابیں اردو، عربی اور انگریزی میں شائع کر چکا ہوں۔ ان تمام مضامین اور کتابوں میں ہمیشہ میں نے کمیونزم اور سوشلزم کی مخالفت کی ہے۔ ایک زمانہ میں بہت سے اسلام پسند سوشلزم کی طرف مائل ہو چکے تھے اور اس کو اسلامی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر میں ہمیشہ اس نظریہ کا مخالف رہا۔

11 جون 1990ء کو نئی دہلی کے روسی سفارت خانہ سے ٹیلیفون آیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ مجھ کو دس روزہ پروگرام کے تحت سوویت روس بھیجنا چاہتے ہیں تاکہ میں وہاں اسلام اور مسلمانوں کے حالات کو براہ راست دیکھوں، نیز یہ کہ 28 جولائی کے لیے انہوں نے میری سیٹ ریزرو کرادی ہے۔

سوویت روس کی موجودہ حکومت کا میرے جیسے ایک ”مخالف“ کو اپنے ملک میں بلانا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ یہ ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید سیکولرزم کی وہ کون سی خصوصیت ہے جو اس کو سارے عالم پر غالب کیے ہوئے ہے۔ وہ یہی فراخ دلی اور برداشت ہے۔ مغربی جمہوریت جس کو اب روس اختیار کر رہا ہے، وہ موافق اور مخالف کی اصطلاحوں سے اوپر اٹھ کر لوگوں سے معاملہ کرتی ہے۔ وہ اپنے ایک مخالف کی پذیرائی کے لیے بھی تیار رہتی ہے۔ اس کی اس صفت نے اس کو یہ طاقت دی ہے کہ وہ ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر سکے۔

موجودہ زمانہ کے اسلامی اداروں کا حال اس معاملہ میں بالکل برعکس ہے۔ ان کے یہاں صرف

اپنے موافق کے لیے جگہ ہے۔ جس شخص کو وہ اپنا مخالف سمجھ لیں، اس کے سایہ سے بھی وہ نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایک شخص اگر کسی اسلامی ادارہ کے ”اکابر“ پر تنقید کر دے تو اس کی تنقید خواہ کتنی ہی علمی اور مدلل کیوں نہ ہو، اس کے بعد وہ شخص اس ادارہ کی نظر میں اتنا مبغوض ہو جائے گا کہ وہ معقول انداز میں اس کا نام بھی نہیں لے سکتے، کجا کہ اس کو اپنے ادارہ کے کسی پروگرام میں شرکت کے لیے بلائیں۔ موجودہ اسلامی اداروں کی یہی کمزوری ہے جس نے ان کو آج کی دنیا میں بالکل بے قیمت بنا دیا ہے۔

کم از کم پچھلے پچاس سال کی بابت میں کہہ سکتا ہوں کہ اس مدت میں غالباً کوئی ایک بھی ایسا انسان پیدا نہ ہو سکا جس کی آج کی دنیا میں کوئی اہمیت ہو۔ زندہ اور اعلیٰ انسان وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں کھلی تنقید اور آزادانہ اختلاف رائے کا ماحول ہو۔ ان اداروں میں یہ ماحول سرے سے موجود ہی نہیں، پھر وہاں اعلیٰ درجہ کے انسان کیوں کر پیدا ہو سکتے ہیں۔

آج اسلام کی نئی تاریخ بنانے کے لیے مجتہدانہ صلاحیت رکھنے والے اعلیٰ افراد درکار ہیں۔ مگر موجودہ اسلامی اداروں میں اکابر پرستی اور تقلید شخصی کا ماحول اتنی گہرائی کے ساتھ چھایا ہوا ہے کہ ان اداروں سے مجتہدانہ اوصاف والی شخصیت کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ ان اداروں سے کسی اعلیٰ انسان کا ابھرنا ویسا ہی ایک عجب ہو گا جیسا کسی قبرستان سے ایک زندہ انسان کا نکل آنا۔ (سفر نامہ غیر ملکی اسفار، جلد 2، روس کا سفر)

زمانے سے بے خبری

علمائے کہا ہے کہ جو شخص اپنے زمانے کے احوال سے واقف نہ ہو، وہ جاہل ہے: مَنْ لَمْ يَنْدِرْ بِعُزْفِ أَهْلِ زَمَانِهِ فَهُوَ جَاهِلٌ (رد المحتار لابن عابدین، جلد 3، صفحہ 724)۔ یہ بات ذاتی عمل کے لیے نہیں ہے، بلکہ ان لوگوں کے لیے ہے، جو دوسروں کے درمیان کام کرنے کے لیے اٹھیں۔ ذاتی عمل کے لیے محدود علم بھی کافی ہے۔ مگر اجتماعی معاملات پر لکھنے اور بولنے کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے کہ آدمی دوسروں کے بارے میں بھرپور واقفیت رکھتا ہو۔ جو اپنے زمانہ کے احوال سے بے خبر ہو اس کے لیے مفتی یا قائد بننا سرے سے جائز ہی نہیں۔ (ڈائری، 12 جنوری 1996)

موجودہ دینی مدارس

دینی مدارس، بلاشبہ موجودہ زمانہ میں اہم دینی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان کے افادی پہلو پر اتنا زیادہ لکھا جا چکا ہے کہ میری طرف سے اس سلسلے میں صرف تصدیق کافی ہے۔ اس پر مزید اضافہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ تاہم دینی مدارس کی بعض علامات مثلاً ان میں باہمی اختلاف بلکہ تصادم یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان میں مسلمہ خوبیوں کے باوجود، کوئی کمی ہے۔ اگر کمی نہ ہو تو یہ ناممکن ہے کہ یہ مدارس مسلمانوں کی باہمی جنگ کا میدان بن جائیں۔ حالانکہ مسلمانوں کی باہمی جنگ سراسر حرام ہے۔

میرے نزدیک وہ کمی یہ ہے کہ یہ مدارس اپنے افراد کو صرف داخلی نشانہ دیتے ہیں، وہ ان کو کوئی خارجی نشانہ نہیں دیتے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ داخلی نشانہ بالآخر باہمی ٹکراؤ پیدا کرتا ہے۔ جب کہ خارجی نشانہ یہ کرتا ہے کہ قوتوں کو خارج کی طرف موڑ کر لوگوں کو آپس کے تصادم سے بچالیتا ہے۔ وہ قوتوں کو خارجی محاذ پر لگا دیتا ہے۔

موجودہ دینی مدارس کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ تحفظ کی نفسیات کے زیر اثر وجود میں آئے۔ چنانچہ ان کا سارا نظام اور نصاب تحفظ کے تحت بنا۔ بالفاظ دیگر ان مدارس نے اول روز سے مسلمانوں کو صرف داخلی نشانہ دیا۔ وہ ان کو کوئی خارجی نشانہ نہ دے سکے۔ اور جس قوم کے افراد کے پاس صرف داخلی نشانہ ہو، وہ ایک حد پر پہنچ کر ہمیشہ آپس میں ٹکرائے شروع کر دیتے ہیں۔

قرآن میں دینی تعلیم کا جو تصور دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ایسے افراد تیار ہوں، جو اقوام عالم پر انداز کا کام کریں (التوبہ، 122: 9)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دینی اداروں کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ وہ قوم کے افراد کو عمل کا خارجی نشانہ دے سکیں۔ تاہم خارجی نشانہ سے میری مراد پر امن خارجی نشانہ ہے، نہ کہ اس قسم کا جارحانہ خارجی نشانہ جس کو موجودہ زمانہ کے جھوٹے قائدین نے دریافت کیا ہے۔

خارجی نشانہ سے میری مراد وہی چیز ہے جس کو قرآن میں انداز کہا گیا ہے۔ یعنی پر امن انداز میں اسلام کے پیغام سے اہل عالم کو باخبر کرنا۔ موجودہ مدارس میں اگر تعلیم کے ساتھ اقوام عالم کے درمیان تعارف اسلام کے عمل کو بھی اس کی صحیح اور موثر صورت میں شامل کر دیا جائے تو مدارس زیادہ با مقصد بن جائیں اور زیادہ مفید بھی۔ (الرسالہ، جنوری، 1985)

امام ابوحنیفہ کا معاشی مسلک

بھٹکل کے سفر (اکتوبر 1984) میں ایک صاحب نے ایک مسجد کا واقعہ بتایا، جس میں بڑی نصیحت ہے۔ ایک شخص نے اس مسجد میں نماز پڑھی۔ اس کے بعد مسجد کے موزن سے پوچھا کہ مجھے ایک نیا جوتا بنوانا ہے، کسی اچھے جوتے ساز کا پتہ بتاؤ تا کہ میں اس سے اپنا جوتا بنواسکوں۔ موزن نے امام صاحب کی طرف اشارہ کیا جنہوں نے ابھی ابھی وہاں نماز پڑھائی تھی۔

مسافر کو یقین نہیں ہوا۔ مگر جب وہ مسجد کے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ مسجد کے نیچے ایک دکان میں وہی شخص جوتا بنانے میں مشغول ہے، جس نے ابھی نماز کے وقت مسجد میں امامت کی تھی۔ مسافر نے دکان میں جا کر امام صاحب سے گفتگو کی اور ان کو اپنے جوتے کا آرڈر دے دیا۔

بتانے والے نے بتایا کہ یہ امام صاحب عام جوتا سازوں سے کافی زیادہ قیمت پر جوتا بناتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے یہاں خریداروں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ کیوں کہ ان کے متعلق لوگوں کو اطمینان ہے کہ ان کا بنایا ہوا جوتا پوری طرح قابل اعتماد ہوگا۔

ہمارے ائمہ اور مدرسین جو امام ابوحنیفہ کے فقہی مسلک پر بہت زور دیتے ہیں اگر وہ امام ابوحنیفہ کے اس ”معاشی مسلک“ کو بھی اختیار کر لیں تو ملت کے آدھے جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں اور اسی کے ساتھ اس کے آدھے مسائل بھی۔ (الرسالہ، جنوری، 1985)

ہمارے مدارس

صحابہ ہمیشہ اساسات دین پر متوجہ رہتے تھے۔ مگر بعد کو عباسی خلافت کے زمانہ میں دوسری قوموں کے اثر سے مسلمانوں کا یہ حال ہوا کہ وہ اساسات دین کے بجائے جزئیات دین کو طے کرنے میں الجھ گئے۔ ان کے درمیان عجمی قوموں کے اختلاط سے نئے نئے مسائل پر بحثیں ہونے لگیں۔ یہ بحثیں حقیقتاً ان امور پر نہ تھیں، جو قرآن وحدیث میں واضح الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں۔ بلکہ زیادہ تر ان پہلوؤں پر تھیں جو لوگوں نے اپنے غیر ضروری قسم کے خوض و تعق سے خود پیدا کیا تھا۔ فقہ میں جزئیاتی امور پر بحثیں پیدا ہو گئیں اور اعتقادات میں کلامی موشگافیوں سے پیدا شدہ مسائل لوگوں کی توجہ کامرکز بن گئے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت جو اسلامی نظام تعلیم بنا، اس میں انھیں فقہی اور اعتقادی بحثوں نے سب سے زیادہ جگہ حاصل کر لی۔ حتیٰ کہ خود قرآن وحدیث بھی اب انھیں اختلافی بحثوں کی روشنی میں پڑھائے جانے لگے۔ یہ انداز تعلیم جو ابتداءً عباسی دور میں رائج ہوا، بعد کو مقدس بن کر اسلامی نظام تعلیم کا لازمی جزء بن گیا اور آج بھی وہ کسی نہ کسی طرح اس کا لازمی جزء بنا ہوا ہے۔ جو چیز صرف اسلام کی تاریخ تھی اس کو اسلام کی حقیقت سمجھ لیا گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی درس گاہوں سے بالکل مختلف انسان بن کر نکلنے لگے جو قرآن کو مطلوب تھے۔ قرآن (35:28) کے مطابق، اللہ تعالیٰ کو اسلامی تعلیم سے ایسے انسان مطلوب ہیں جو اللہ سے ڈریں (إِنَّمَا يُخَشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ)، اور جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ (9:122) ہے، وہ دنیا کے لوگوں کو آنے والے سخت دن سے ہوشیار کریں (لِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذْ رَجَعُوا إِلَيْهِمْ)۔ مگر اب اسلام کے تعلیمی نظام سے ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جو جزئیاتی بحثوں کے ماہر ہوں اور اختلافی مسائل میں کمال فن کی داد دے سکیں۔

اس فرق کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہمارے مدارس سے وہ مطلوبہ نتیجہ حاصل نہ ہو سکا جس مقصد

کے لیے وہ قائم کیے جاتے ہیں۔ اگر آپ خدا کی عظمت کا تذکرہ کریں اور جنت و جہنم کو یاد کریں تو آپ کے اندر خشوع اور تقویٰ کے جذبات پیدا ہوں گے۔ اس کے برعکس، اگر آپ ظاہری جزئیات اور لفظی موشگافیوں میں بحث و مباحثہ کریں تو اس سے آپ کو صرف قساوت کی غذا ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے مدارس سے بڑی تعداد میں ایسے لوگ نکلتے ہیں جن میں خشوع اور تقویٰ کے بجائے غفلت اور قساوت پائی جاتی ہے۔ (الرسالہ، مئی 1985)

ایک سبق آموز واقعہ

ایک دیوبندی عالم سے ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو انھوں نے بتایا کہ ایک بار ہمارے مدرسہ میں امتحان کے پرچہ میں ایک سوال یہ تھا کہ اخلاق اور معاشرت سے متعلق دو حدیث لکھیے۔ مگر بہت کم طلبہ اس کے جواب میں دو حدیث لکھ سکے۔ حالانکہ انہیں طلبہ کا حال یہ تھا کہ رفع یدین اور اس قسم کے دوسرے اختلافی مسائل پر سوال ہو تو وہ اس کے جواب میں گھنٹوں تقریر کر سکتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان طلبہ کو جب حدیث کی کتابیں پڑھانی جاتی ہیں تو استاد اخلاق اور معاشرت جیسی حدیثوں کی صرف لفظی قرأت کر کے گزر جاتا ہے مگر جب رفع یدین اور آئین بالجہر جیسے اختلافی مسائل آتے ہیں تو وہ ان پر کئی کئی دن تک تقریر کرتا ہے اور ان پر اپنی معلومات کا دریا بہاتا ہے۔ یہ طریقہ درس ظاہر ہے کہ اسی قسم کے علما پیدا کرے گا جس کا ذکر مذکورہ دیوبندی عالم نے کیا۔

(ڈائری، 14 فروری 1998)

ناموافق حالات ترقی کا زینہ بن گئے

ایک ”ملاچی“ دہلی کی ایک مسجد میں امام تھے۔ امامت کے علاوہ ان کی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ وہ روزانہ قرآن کا درس دیں۔ ان تمام خدمات کا معاوضہ تھا— ماہانہ 25 روپے تنخواہ، مسجد میں ایک حجرہ اور دو وقت کا کھانا۔ نوجوان ملاچی اس مختصر معاوضہ پر قانع ہونے کے لیے تیار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مسجد میرے لیے کم از کم ایک ٹھکانا تو ہے۔ یہاں رہ کر میں اپنے بچے کی تعلیم پوری کرالوں گا۔ میں نہیں تو میرا بچہ مستقبل میں بہتر معاشی زندگی حاصل کر لے گا۔

مگر مسجد کے لوگوں کا سلوک ان کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ ہر نمازی ان کو اپنا ملازم سمجھتا۔ ذرا ذرا سی بات میں ہر آدمی ان کے اوپر برس پڑتا اور ان کو ذلیل کرتا۔ کوئی فرش کے لیے، کوئی جھاڑو کے لیے، کوئی لوٹے کے لیے، کوئی کسی اور چیز کے لیے ان پر بگڑتا رہتا۔ وہ معاشی تنگی برداشت کر سکتے تھے۔ مگر ذلت ان کے لیے برداشت سے باہر تھی۔ بالآخر انھوں نے ایک نیا فیصلہ کیا۔ انھوں نے طے کیا کہ مجھے اپنی زندگی کو مستقل طور پر مسجد سے وابستہ نہیں رکھنا ہے۔ بلکہ اپنے لیے کوئی دوسرا کام پیدا کرنا ہے۔ تاہم فوری طور پر مسجد چھوڑنا بھی بُرا تھا۔ کیونکہ مسجد کی امامت چھوڑنے کے بعد مسجد کا حجرہ ان سے چھین جاتا۔ اور شہر میں دوسری جگہ حاصل کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔

انھوں نے مسجد کی امامت کرتے ہوئے شہر کے طبیبہ کالج میں داخلہ لے لیا اور خاموشی کے ساتھ طب کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ طبی تعلیم کی تکمیل میں ان کو پانچ سال لگ گئے۔ اس دوران وہ مسجد کے لوگوں کے برے سلوک کو پہلے سے بھی زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔ نئے فیصلہ میں کامیاب ہونے کے لیے ضروری تھا کہ وہ صبر کریں۔ ذلت کی زندگی سے نکلنے کی خاطر ذلت کی زندگی کو چند سال اور برداشت کریں۔

بالآخر وہ وقت آیا کہ انھوں نے طبی کالج سے ڈاکٹری کی سند حاصل کر لی۔ اب انھوں نے مسجد والوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے امامت سے استعفیٰ دے دیا اور شہر کے ایک محلہ میں ایک جگہ کرایہ

پر لے کر اپنا مطب کھول لیا۔ ان کی زندگی کے تلخ تجربات اور مستقبل کی خاطر ان کی طویل جدوجہد نے ان کو بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ انھوں نے نہایت محنت اور ہوشیاری کے ساتھ اپنا مطب چلایا۔ صرف چھ ماہ بعد ان کی آمدنی اتنی ہو گئی کہ ایک مکان لے کر وہ بچوں کے ساتھ بفر اغت رہنے لگے۔ ایک سال کے بعد انھیں مقامی طبی کالج میں لیکچرر کی جگہ بھی مل گئی۔ اس طرح ان کی معاشی زندگی میں مزید استحکام پیدا ہو گیا۔ کل کے ملاجی اب ڈاکٹر صاحب بن کر زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کو عزت بھی حاصل ہے اور معاشی فارغ البالی بھی۔

زندگی کے ناموافق حالات زندگی کے نئے زینے ہوتے ہیں جن کو استعمال کر کے آدمی آگے بڑھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ناموافق حالات سے نفرت اور شکایت کا سبق نہ لے۔ بلکہ مثبت ذہن کے تحت اپنے لیے نیا مستقبل بنانے میں لگ جائے۔ (الرسالہ، مئی 1982)

انتم گیت

ٹیکور نے کہا تھا کہ ساری عمر باجے کے تاروں کو درست کرنے میں بیت گئی، اور میں انتم گیت نہ گا سکا۔

The song that I came to sing remains unsung to this day.
(Gitanjali, Ch. 13)

میرا نشانہ انتم گیت نہ تھا بلکہ جنت تھا۔ میں کہوں گا کہ ساری عمر جنت کے شوق میں بیت گئی اور میں جنت کی اہلیت کا ثبوت نہ دے سکا۔ اب 75 سال کی عمر کو پہنچ کر میں اپنی عمر کے آخری مرحلہ میں ہوں۔ بہت جلد میں اپنے آپ کو اگلی دنیا میں پاؤں گا۔ اہلیت کی بنا پر تو میں جنت کا مستحق نہیں الایہ کہ اللہ اپنی رحمت خاص سے مجھے جنت میں داخلہ دے دے۔ (ڈائری، 31 دسمبر 1996)

تعلیمی پیغام

(زیر نظر پیغام مولانا وحید الدین خاں صاحب نے مدینہ ٹیکنیکل کالج، حیدرآباد، کے سونیر کے لیے لکھا تھا)

تعلیم صرف روزگار کا سرٹیفکیٹ نہیں۔ اس کا اصل مقصد قوم کے افراد کو باشعور بنانا ہے۔ افراد کو باشعور بنانا ملت کی تعمیر کی راہ کا پہلا قدم ہے۔ ملت کا سفر جب بھی شروع ہوگا یہیں سے شروع ہوگا۔ اس کے سوا کسی اور مقام سے ملت کا سفر شروع نہیں ہو سکتا۔

باشعور بنانا کیا ہے۔ باشعور بنانا یہ ہے کہ ملت کے افراد ماضی اور حال کو ایک دوسرے سے جوڑ سکیں۔ وہ زندگی کے مسائل کو کائنات کے ابدی نقشہ میں رکھ کر دیکھ سکیں۔ وہ جانیں کہ وہ کیا ہیں، اور کیا نہیں ہیں۔ وہ اس راز سے واقف ہوں کہ وہ اپنے ارادہ کو خدا کے ارادہ سے ہم آہنگ کر کے ہی خدا کی اس دنیا میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ باشعور انسان ہی حقیقی معنوں میں انسان ہے۔ جو باشعور نہیں وہ انسان بھی نہیں۔

باشعور آدمی اپنے اور دوسرے کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ وہ یہ جان لیتا ہے کہ اس کی کون سی رائے جانب دارانہ رائے ہے اور کون سی غیر جانب دارانہ۔ جب بھی کوئی موقع آتا ہے تو وہ پہچان لیتا ہے کہ یہاں کون سی کارروائی رد عمل کی کارروائی ہے اور کون سی مثبت کارروائی۔ وہ شر کو خیر سے جدا کرتا ہے اور باطل کو الگ کر کے حق کو پہچانتا ہے۔ ایک آنکھ وہ ہے جو ہر آدمی کی پیشانی پر ہوتی ہے۔ تعلیم آدمی کو ذہنی آنکھ عطا کرتی ہے۔ عام آنکھ آدمی کو ظاہری چیزیں دکھاتی ہے، تعلیم کی آنکھ آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ معنوی چیزوں کو دیکھ سکے۔

جس طرح ایک کسان بیج کو درخت بناتا ہے، اسی طرح تعلیم گاہ کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کو فکری حیثیت سے اس قابل بنائے کہ وہ ارتقائے حیات کے سفر کو مکمل کر سکے۔ تعلیم آدمی کو ملازمت بھی دیتی ہے۔ مگر یہ تعلیم کا ثانوی فائدہ ہے۔ تعلیم کا اصل پہلو یہ ہے کہ وہ آدمی کو زندگی کی سائنس بتائے۔ وہ آدمی کو حقیقی معنوں میں آدمی بنا دے۔ (الرسالہ، مئی 1985)

زیر نظر شمارہ علماء اور مدارس کے موضوع پر نئی کتاب کے منتخب مضامین پر مشتمل ہے۔

इंसान हों। वे कोई ठोस निर्णय नहीं ले पाते। उनमें न साहस होता है और न ही संकल्प शक्ति (will power)। ऐसे लोग अपनी ज़िंदगी में कोई बड़ा काम नहीं कर पाते।

वास्तविक इंसान वह है जो मज़बूत संकल्प शक्ति (strong will power) का मालिक हो। जो ज़िंदगी के मामलों में निर्णय लेने की क्षमता रखता हो। जो 'हाँ' के साथ 'नहीं' कहने की ताक़त रखता हो। जो अपने लक्ष्य की राह में दूसरों से समझौता न करे। ऐसा ही इंसान कोई बड़ा काम करने में सफल होता है।

बड़ा काम करने के दौरान हमेशा ऐसे हालात पैदा होते हैं, जो इंसान के रास्ते में रुकावट (obstacles) डालते हैं। कमज़ोर संकल्प वाला व्यक्ति ऐसे समय पर हिम्मत हारकर बैठ जाता है। इसके विपरीत, मज़बूत संकल्प वाला व्यक्ति हर हाल में अपना सफर जारी रखता है, यहाँ तक कि वह अपनी मंज़िल तक पहुँच जाता है।

ज़िंदगी के सफर में हमेशा ऐसा होता है कि रास्ते में कुछ नकारात्मक (negative) अनुभव सामने आते हैं। ये नकारात्मक अनुभव हमेशा अस्थायी (temporary) होते हैं। जो लोग प्रकृति के इस रहस्य को नहीं समझते, वे नकारात्मक अनुभव को अंतिम समझ लेते हैं और इस आधार पर वे हिम्मत हार बैठते हैं।

सही यह है कि इंसान इन अनुभवों को अस्थायी माने। ऐसे अनुभव सामने आने पर वह भविष्य पर नज़र रखते हुए अपना सफर जारी रखे। वह यक़ीन रखे कि प्रकृति के नियम के मुताबिक, रुकावट केवल एक अस्थायी चीज़ बनकर रह जाती है और आगे के चरणों में अपने आप दूर होती चली जाती है।

जो लोग प्रकृति के इस नियम को नहीं समझते, वे कमज़ोर संकल्प वाले बन जाते हैं। और जो लोग इस रहस्य को समझ लेते हैं, वे मज़बूत संकल्प के साथ काम लेते हुए आख़िरकार सफलता की मंज़िल तक पहुँच जाते हैं।

"लक्ष्य निर्धारित कीजिए और उस पर डटे रहिए— यही इस दुनिया में सफलता का रहस्य है।"

अपवाद (exception) बुद्धिमान हस्तक्षेप (intelligent intervention) का संकेत होते हैं, और बुद्धिमान हस्तक्षेप स्वयं एक बुद्धिमान सृष्टिकर्ता (intelligent Creator) के अस्तित्व का सबूत है।

उदाहरण के लिए, विशाल ब्रह्मांड में सौरमंडल (solar system) एक अपवाद है। सौरमंडल में ग्रह पृथ्वी (planet earth) एक अनूठा अपवाद है। पृथ्वी का अत्यंत संतुलित आकार, उसका अपने अक्ष (axis) पर घूमना, पृथ्वी पर जीवन समर्थन तंत्र (life support system) और जीवन की उपस्थिति – ये सभी अपवाद हैं। यहां तक कि पृथ्वी पर मनुष्य का होना भी एक अपवाद है।

इस प्रकार के विभिन्न अपवाद, जो हमारी दुनिया में देखे जाते हैं, केवल आकस्मिक नहीं हैं, बल्कि अत्यंत अर्थपूर्ण (meaningful) हैं। विशाल ब्रह्मांड में ऐसे अर्थपूर्ण अपवाद यक्रीनी तौर पर ये साबित करते हैं कि कायनात का एक सृष्टा है। सृष्टिकर्ता ने एक सोचे-समझे और योजनाबद्ध ढांचे के तहत कायनात को रचा है। जहाँ चाहा, उसने चीजों में एकरूपता (uniformity) लाई, और जहाँ चाहा, किसी चीज़ को अन्य से विशिष्ट और अलग बना दिया।

उदाहरण के लिए, जानदारों की बनावट में समानता मिलती है, लेकिन सभी जानदारों का पीढ़ीगत कोड (genetic code) एक-दूसरे से अलग होता है। सबके हाथों की उंगलियाँ मिलती-जुलती हैं, पर हर व्यक्ति का अंगूठे का निशान अलग होता है। इन समानताओं के बीच यह अपवाद साफ बताता है कि यह एक बुद्धिमान रचना (intelligent creation) है, केवल संयोग का नतीजा नहीं।

संकल्प शक्ति का महत्व

जानवरों में कुछ ऐसे जीव होते हैं जिनमें रीढ़ की हड्डी नहीं होती। इसी तरह इंसानों में भी कुछ लोग कमजोर इरादे वाले होते हैं, मानो वे भी बिना रीढ़ (spineless) के

इसी प्रकार, एक सीमित अवधि जीने के बाद इंसान मर जाता है। मौत का यह अनुभव उसके लिए एक नए सफ़र की शुरुआत होता है। मौत के बाद इंसान एक ऐसी दुनिया में प्रवेश करता है जहाँ वह फिर से अकेला होता है। हालांकि वह पहले की तरह एक जीवंत और संवेदनशील अस्तित्व रखता है, लेकिन पिछली दुनिया में प्राप्त सारी सुविधाएँ उससे छूट जाती हैं। फिर उसे इस बात की आवश्यकता होती है कि उसे सभी चीज़ें नवीनीकरण के साथ पुनः प्राप्त हों, ताकि वह सुरक्षा और शांति भरी ज़िंदगी बिता सके।

इंसान को पहली ज़िंदगी का अनुभव इसलिए कराया जाता है ताकि उसके दिल से यह दुआ निकल पड़े:

“ऐ मेरे रब, जिस तरह तूने पहली ज़िंदगी में बिना किसी योग्यता के मेरी सारी ज़रूरतें पूरी कर दीं, उसी तरह दूसरी ज़िंदगी में भी तू अपनी रहमत से मुझे मेरी ज़रूरतों से बढ़कर अता फ़रमा।”

पहली ज़िंदगी में मैंने तेरी कृपाओं का प्रारंभिक स्वाद पाया था; अब दूसरी ज़िंदगी में तू उन्हें मेरे लिए पूर्ण और परिपूर्ण कर दे। पहली ज़िंदगी में तूने मुझे बिना किसी योग्यता या हक़ के जो कुछ भी दिया, वह सब तेरी ही दया थी—उसी तरह दूसरी ज़िंदगी में भी, मेरी अयोग्यता के बावजूद, तू मुझे सब कुछ अता कर दे। यदि पहली ज़िंदगी मेरे लिए तेरी बख़्शिशाँ की शुरुआत थी, तो दूसरी ज़िंदगी में तू उन बख़्शिशाँ की पूर्णता का प्रबंध कर दे।

अर्थपूर्ण अपवाद

ब्रह्मांड में अनगिनत विभिन्न चीज़ें पाई जाती हैं, लेकिन ब्रह्मांड का एक चमत्कारिक पहलू यह है कि इसमें आम तौर पर एकरूपता (uniformity) नहीं है, बल्कि हर हिस्से में अपवाद (exceptions) मौजूद हैं। ये अपवाद इस बात का प्रमाण हैं कि ब्रह्मांड का एक महान सृष्टिकर्ता है।

कहा गया है कि व्यक्ति को केवल वैध तरीके से ही अपनी रोजी कमाना चाहिए, कभी अवैध तरीके का सहारा नहीं लेना चाहिए।

परंतु अक्सर ऐसा होता है कि इंसान केवल आवश्यकता तक सीमित नहीं रहता, बल्कि लालच (greed) का शिकार हो जाता है। लालच का सबसे घातक रूप तब सामने आता है जब व्यक्ति अपनी हलाल आजीविका को हराम आजीविका में बदलकर उपयोग करता है। उदाहरण स्वरूप, सेवा करना लेकिन अपनी ड्यूटी का सही ढंग से पालन न करना, व्यापार करना और ग्राहक को धोखा देकर पैसा कमाना आदि। ऐसी आदतें यह दर्शाती हैं कि व्यक्ति ने वैध आजीविका पाकर भी अनावश्यक रूप से उसे अवैध बना लिया है।

यह मामला अत्यंत गंभीर है। कई लोग बढ़े हुए लालच के कारण अपनी हलाल रोजी को हराम कर लेते हैं, और फिर सुंदर बहानों और झूठ के ज़रिये अपनी गलतियों को छुपाते रहते हैं। वे अनियमित तरीकों का सहारा लेते हैं और शब्दों की खूबसूरती से अपने आप को सही दिखाते हैं। हालांकि, ईश्वर की नज़र में ऐसे लोग अत्यंत निंदनीय हैं और आखिरत में उन्हें कड़ी सज़ा का सामना करना पड़ेगा।

पहली ज़िंदगी, दूसरी ज़िंदगी

जब इंसान पैदा होकर इस मौजूदा दुनिया में आता है, तो यह उसकी पहली ज़िंदगी होती है। यहाँ उसकी मर्ज़ी के बिना उसके लिए सब कुछ उपलब्ध होता है। जैसे ही वह जन्म लेता है, उसे एक प्यार भरा परिवार मिल जाता है, और उसे एक ऐसी दुनिया प्राप्त होती है जो उसके लिए अत्यंत अनुकूल होती है। उसे एक पूर्ण जीवन प्रणाली (life support system) प्राप्त हो जाती है, जिसके बिना उसकी ज़िंदगी संभव नहीं होती। ये सारी चीज़ें उसे एकतरफा रूप से मिल जाती हैं, चाहे वह उन्हें सचेत रूप से अनुभव करे या न करे।

इतना भी नहीं कहा कि “तुम वक्रत से पहले क्यों तक्राजा कर रहे हो?” इसके बजाय आपने हज़रत उमर को रोका और कहा, “ऐ उमर, मैं और यह एक और चीज़ के ज़्यादा मुहताज थे; वह यह कि तुम मुझको क़र्ज की बेहतर अदायगी के लिए कहते और इसको बेहतर तक्राजे के लिए।” इसके बाद हुक़्म दिया कि ज़ैद बिन सअना को तयशुदा मात्रा में खजूरे दे दी जाएं। इसके अलावा उन्हें 20 साअ खजूरे और ज़्यादा दी जाएं। ज़ैद बिन सअना आपके इस अच्छे सलूक से इतने प्रभावित हुए कि उन्होंने इस्लाम अपना लिया। (अल-मोज़म अल-कबीर, हदीस संख्या 371)

पैग़म्बरे इस्लाम (सल्ल०) उस समय अरब के शासक थे वह ज़ैद बिन सअना के खिलाफ़ कोई भी सख़्त कार्रवाई करने का पूरा इख़्तियार रखते थे। इसके बावजूद आपने ज़ैद बिन सअना की गुस्ताख़ी और बदसलूकी को एकतरफ़ा तौर पर बर्दाश्त किया। उसकी उत्तेजना के जवाब में आप उत्तेजित नहीं हुए, आप पूरी तरह शांत रहे। यह एक ऐतिहासिक और आदर्श मिसाल है, जो अपने आप में सम्पूर्ण है, और जो बताती है कि आदर्श इन्सान की सलूक कैसा होना चाहिए, और यह कैसे संभव है कि सामाजिक ज़िन्दगी में एक शख्स सब्र और बर्दाश्त, धैर्य और सहनशीलता के साथ कैसे ज़िन्दगी गुज़ारे।

हलाल को हराम बनाना

रोज़ी कमाना हर व्यक्ति की आवश्यकता है। लोग विभिन्न कार्य करके अपनी आजीविका अर्जित करते हैं – जैसे कि सेवा, व्यापार, कृषि आदि। ये सभी तरीक़े वैध (जायज़) तरीक़े हैं, और व्यक्ति का यह अधिकार है कि वह इन स्रोतों में से किसी भी माध्यम को चुन सकता है।

हालांकि, आजीविका कमाने के दो तरीक़े होते हैं – एक वैध और दूसरा अवैध। वैध वह है जो ईमानदारी (honesty) पर आधारित होता है, जबकि अवैध वह है जो बेईमानी (dishonesty) का परिणाम होता है। इस संदर्भ में शरीअत में ज़ोर देकर

अस्थायी घटना होती है। इस दुनिया में हर असफलता के बाद सफलता का एक नया अवसर आता है, बशर्ते व्यक्ति धैर्यपूर्वक उसका इंतजार करे।

इंतजार का अर्थ निष्क्रिय बने रहना नहीं है। इसका मतलब है कि इंसान अपनी कोशिशों को लगातार जारी रखे। वह हर असफलता को अस्थायी माने और भविष्य के प्रति अपनी आशा को कभी समाप्त न होने दे। वह बीती बातों में उलझने के बजाय आगे की दिशा में बढ़ता रहे। भावनाओं में बहकर निर्णय लेने से बचे और यथार्थ पर आधारित योजनाओं को अपनाए। जीवन में यह हमेशा आवश्यक होता है कि व्यक्ति अपने अनुभवों के आधार पर अपने मामले का नए सिरे से आकलन करे और नई सोच के साथ आगे की योजना बनाए। यही बेहतर भविष्य की ओर बढ़ने का एकमात्र प्रभावी मार्ग है।

सब्र और सहनशीलता

पैगम्बरे इस्लाम सल्लल्लाहु अलैहि व सल्लम के जीवन की एक घटना है। एक अकाल पीड़ित इलाके में राहत कार्य के लिए आपने एक यहूदी व्यापारी से कुछ दीनार कर्ज लिए। इस यहूदी का नाम ज़ैद बिन सअना था। ज़ैद बिन सअना से यह तय हुआ कि आप एक निश्चित समय के बाद 80 मिस्काल खजूरे अदा करेंगे।

खजूरों की अदायगी के वक़्त में अभी दो-तीन दिन बाक़ी थे कि ज़ैद बिन सअना अचानक आए और बिगड़ते हुए अपने कर्ज का तक्राज़ा किया। उस समय आपके कंधे पर एक चादर थी। ज़ैद बिन सअना ने चादर को पकड़ कर ज़ोर से खींचा और कहा, “ऐ मुहम्मद, मेरा कर्ज अदा क्यों नहीं करते। खुदा की क़सम, मैं मुत्तलिब की औलाद को जानता हूँ, वो सबके सब कर्जचोर हैं।”

उस वक़्त हज़रत उमर आपके पास मौजूद थे। वह गुस्सा हो गए। उन्होंने बिगड़कर कहा, “ऐ अल्लाह के दुश्मन, तू यह क्या कह रहा है। क्या तू इससे नहीं डरता कि तेरी गर्दन उड़ा दी जाए?” लेकिन पैगम्बरे इस्लाम ने बिल्कुल गुस्सा नहीं किया,

वर्तमान जीवन का सिद्धांत यह है कि चाहे इंसान कुछ न भी करे, फिर भी उसकी जरूरतों के लिए आवश्यक साधन और संसाधन उसे एकतरफ़ा रूप से मिलते रहते हैं। लेकिन आने वाले जीवन का नियम इससे बिल्कुल अलग है। अगले जीवन का सिद्धांत है—जैसा बोओगे, वैसा ही काटोगे। हैरानी की बात यह है कि लोग इस वर्तमान जीवन के लिए तो बहुत भाग-दौड़ करते हैं, लेकिन अगले जीवन के बारे में पूरी तरह बेपरवाह बने रहते हैं।

एक बेहतर भविष्य की ओर

यह एक उच्च शिक्षित मुस्लिम व्यक्ति की कहानी है। उन्होंने एक विश्वविद्यालय से प्रथम श्रेणी की डिग्री प्राप्त की और इसके बाद उन्हें एक अच्छी नौकरी मिली। वे इस नौकरी से खुश थे, लेकिन कुछ समय बाद उनके और उनके बॉस के बीच मतभेद हो गया। मतभेद इतना बढ़ गया कि उन्हें अपनी नौकरी छोड़नी पड़ी। इसके बाद मेरी उनसे मुलाकात हुई। वे बहुत निराश और चिंतित थे। मैंने उन्हें समझाया और फिर उनकी डायरी में ये शब्द लिख दिए:

"कभी-कभी माली एक पेड़ को एक स्थान से उखाड़ता है, केवल इसलिए ताकि वह उस पेड़ को एक बेहतर स्थान पर लगा सके, जहाँ वह अधिक फल-फूल सके" (4 अक्टूबर, 1981)।

इस सलाह के बाद उन्होंने अपनी कोशिश जारी रखी, और अंततः वे पहले से भी अधिक सफल हो गए।

यह प्रकृति का एक नियम है। यह नियम हर चौबीस घंटे में खामोश भाषा में इंसान को बताया जाता है। हर कोई जानता है कि हमारी दुनिया में हर शाम के बाद फिर से सुबह होती है। हर रात के बाद फिर से दिन का उजाला फैल जाता है। यह प्रकृति की खामोश भाषा है, जो हमें बताती है कि इस दुनिया में असफलता हमेशा एक

जाता है। ऐसे लोगों की स्थिति यह होती है कि वे हमेशा अपने परिवार से ही प्यार करते हैं और बाक़ी सभी लोगों के प्रति उनके दिल में केवल नफ़रत होती है।

लक्ष्यहीन दौड़

हर व्यक्ति बिना थके बोल रहा है। हर व्यक्ति अपनी ज़रूरतों को अंतिम सीमा तक बढ़ा चुका है। हर कोई अपनी इच्छाओं को अनंत रूप से पूरा करना चाहता है। हर व्यक्ति चाहता है कि वह आराम और सुख की सारी चीज़ें अपने लिए और अपने बच्चों के लिए जमा कर ले। यह भौतिकता (materialism) की ओर एक पागल दौड़ है, लेकिन इसका परिणाम क्या निकल रहा है? हर व्यक्ति इस एहसास में जीता है कि उसकी इच्छाएं पूरी नहीं हुईं जो संतोष वह चाहता था, वह उसे नहीं मिल सका। हर महिला और पुरुष इसी हताशा के एहसास में जीते हैं। इस तरह उनकी ज़िंदगी के दिन और रात यूँ ही गुज़रते रहते हैं, जब तक कि उनकी इच्छाओं का घरोँदा हालात के किसी तूफ़ान से टकराकर बिखर नहीं जाता। और अगर परिस्थितियाँ उसे न भी तोड़ पाएं, तो मृत्यु अपने तय समय पर आ ही जाती है और हर व्यक्ति को उसके कठोर निर्णय के सामने झुकने पर मजबूर कर देती है— जैसा कि इससे पहले दुनिया में आने वाले सभी लोगों को विवश हो कर दुनिया से जाना पड़ा।

लोग मौत से पहले के अस्थायी जीवन के लिए प्रबंध करने में व्यस्त हैं, जबकि असली आवश्यकता यह है कि मौत के बाद के शाश्वत जीवन के लिए खुद को तैयार किया जाए। मौत से पहले का जीवन एक परीक्षा का जीवन है। इस आधार पर अल्लाह की यह ज़िम्मेदारी है कि वह प्रत्येक व्यक्ति को वह साधन और परिस्थितियाँ प्रदान करे, जिनके माध्यम से वह अपनी परीक्षा दे सके। लेकिन जहाँ तक मृत्यु के बाद के जीवन का प्रश्न है, उसकी ज़िम्मेदारी अल्लाह ने अपने ऊपर नहीं ली है। मृत्यु के बाद का जीवन पूरी तरह मनुष्य के अपने कर्मों और आचरण पर निर्भर करता है।

लाड-प्यार का संकट

आम तौर पर देखा गया है कि माता-पिता अपने बच्चों के साथ अत्यधिक लाड-प्यार का व्यवहार करते हैं, उनकी हर इच्छा पूरी करते हैं ताकि वे खुश रहें। इस प्रकार का लाड-प्यार एक बड़ी चुनौती है। इस लाड-प्यार का परिणाम यह होता है कि बच्चों के मन में प्यार का एक काल्पनिक मापदंड बन जाता है।

यह काल्पनिक मापदंड माता-पिता के व्यवहार पर आधारित होता है। धीरे-धीरे यह किसी व्यक्ति के मन में इतना गहराई से बैठ जाता है कि वे इसके खिलाफ़ सोच भी नहीं सकते। वे इस मापदंड को पूर्ण सत्य मान लेते हैं, और इसके विपरीत सोचना उनके लिए असंभव हो जाता है। इसका अंतिम परिणाम यह होता है कि व्यक्ति यह समझने लगता है कि केवल मेरे माता-पिता ही मुझसे प्यार करते हैं, माता-पिता के अलावा इस दुनिया में मुझसे प्यार करने वाला कोई नहीं है। प्यार का यह मापदंड व्यक्ति के लिए घातक साबित होता है। इसका नतीजा यह निकलता है कि वह अपने माता-पिता के प्रति अत्यधिक पक्षपाती और सकारात्मक सोच रखता है, जबकि दूसरों के प्रति उसका रवैया बेहद नकारात्मक हो जाता है। वह अपने माता-पिता के बारे में भी सच्चाई से दूर रहता है और दूसरों के बारे में भी वास्तविकता को नज़रअंदाज़ करता है।

मनुष्य अपने बचपन का केवल एक छोटा सा हिस्सा अपने माता-पिता के साथ घर में बिताता है। इसके बाद वह बाहर की दुनिया में प्रवेश करता है, एक ऐसी दुनिया में जहाँ चुनौतियाँ हैं, प्रतियोगिता है, और जहाँ कठिन परिस्थितियों का सामना करते हुए अपनी ज़िंदगी को बनाना होता है।

ऐसे में, माता-पिता की ओर से अपने बच्चों के प्रति सबसे अच्छी शुभकामना यह होगी कि वे उन्हें बाहरी दुनिया का सामना करने के लिए तैयार करें। उन्हें जीवन की सच्चाइयों से अवगत कराएँ। लाड-प्यार से जो मानसिकता बनती है, वह केवल घर के अंदर ही काम आती है। घर से बाहर निकलते ही लाड-प्यार का महत्व समाप्त हो

सकता। इंसान के पास चलने के लिए पैर हैं, लेकिन अगर पृथ्वी में संतुलित गुरुत्वाकर्षण (gravitational force) न हो, तो वह चल नहीं सकता। इंसान के पास खाने के लिए मुँह है, लेकिन अगर बाहर भोजन का सामान न हो, तो वह खाने की आवश्यकता पूरी नहीं कर सकता।

अब एक ऐसे समय की कल्पना कीजिए, जब आप पूरी तरह से अपने इस अस्तित्व के साथ जीवित होंगे, लेकिन वहाँ आपकी ज़रूरत के सभी साधन आपसे छिन चुके होंगे। आपके पास आँखें होंगी, लेकिन देखने के लिए रोशनी मौजूद नहीं होगी। आपके पास मुँह होगा, लेकिन खाने की चीजें वहाँ से गायब हो चुकी होंगी। आपके पास पैर होंगे, लेकिन वहाँ संतुलित गुरुत्वाकर्षण वाली ज़मीन आपके पैरों के नीचे मौजूद नहीं होगी। और साथ ही, आप अकेले होंगे, आपके सभी अपने लोग आपका साथ छोड़ चुके होंगे।

यह कोई काल्पनिक बात नहीं है। यही स्थिति हर महिला और पुरुष के साथ मौत के बाद सामने आएगी, और मौत हर महिला और पुरुष पर ज़रूर आनी है। जो भी व्यक्ति आज जीवित है, वह एक दिन मर जाएगा। और फिर मौत के बाद, वह अपने आप को जिस दुनिया में पाएगा, वह वही दुनिया होगी जिसका वर्णन ऊपर किया गया है।

यह आने वाला दिन हर किसी के लिए तेज़ी से नज़दीक आ रहा है। हर महिला और पुरुष की पहली आवश्यकता यह है कि वह इस आने वाले दिन को समझे और इसके लिए तैयारी करे। वह दिन जब आएगा, तो वह "पॉइंट ऑफ़ नो रिटर्न" (point of no return) पर आएगा। इसके बाद आदमी को केवल भुगतना होगा, और न ही पीछे लौट कर पुनः तैयारी करने का अवसर मिलेगा। जन्म के बाद ही हर महिला और पुरुष का काउंटडाउन (countdown) शुरू हो जाता है। किसी को नहीं पता कि उनका यह काउंटडाउन कब अपने अंतिम नंबर पर पहुंच जाएगा।

यह हदीस बहुत डराने वाली है। इसकी रौशनी में मौजूदा ज़माने के मुसलमानों को खास तौर पर अपना मुहासबा (आत्मनिरीक्षण- introspection) करना चाहिए। उन्हें ग़ौर करना चाहिए कि उनका हज इस हदीस-ए-रसूल का उदाहरण तो नहीं बन गया है। अमीर लोग सोचें कि उनके हज में तक्रवा की भावना है या सिर्फ़ सैर-तफ़रीह (outing) की भावना। आम लोग यह सोचें कि वे दीनी फ़ायदे के लिए हज करने जाते हैं या व्यापारिक फ़ायदे के लिए। आलिम यह सोचें कि वे अब्दियत (बंदगी) का सबक लेने के लिए बैतुल्लाह (काबा) जाते हैं, या अपनी पेशवाई (नेतृत्व) को ऊँचा करने के लिए। इसी तरह ग़रीब लोग यह सोचें कि हज को उन्होंने अल्लाह से माँगने का ज़रिया बनाया है, या इंसानों से माँगने का।

इस हदीस-ए-रसूल में भविष्यवाणी के अंदाज़ में बताया गया है कि जब उम्मत पर ज़वाल (पतन) आएगा, तो उस समय लोगों की स्थिति कैसी होगी। दौर-ए-उरूज (विकास के दौर) में उम्मत की हालत यह होती है कि दीन का अध्यात्मिक पहलू प्रमुख रहता है और उसका मादी (भौतिक) पहलू दबा हुआ रहता है। पतन के दौर में इसके विपरीत स्थिति हो जाती है कि लोगों के बीच दीन का अध्यात्मिक पहलू दब जाता है और भौतिक पहलू प्रमुख हो जाता है। पहले दौर में तक्रवा (अल्लाह का भय) को मूल स्थान प्राप्त होता है और भौतिक चीज़ें केवल आवश्यकता के स्तर पर रहती हैं। इसके उलट, दौर-ए-ज़वाल में भौतिक चीज़ें ही मूल बन जाती हैं और कुछ ज़ाहिरी व दिखावटी बातों को तक्रवा का नाम दे दिया जाता है। यही स्थिति हज और उमरा के साथ भी पेश आती है और इस्लाम की दूसरी इबादतों के साथ भी।

जीवन के उस पार

आदमी बाहरी तौर पर एक पूर्ण अस्तित्व जान पड़ता है, लेकिन सच में वह केवल एक अधूरा अस्तित्व है। इंसान के पास आँखें हैं, लेकिन बाहरी रोशनी के बिना वह नहीं देख सकता। इंसान के पास कान हैं, लेकिन बाहरी हवा के बिना वह सुन नहीं

के संदेश को लोगों तक पहुँचाने के इस अमल को जीवित रखेंगे, यहाँ तक कि क्रयामत आ जाए।

इस इब्राहीमी अमल में कुर्बानी को केंद्रीय स्थान प्राप्त है। यह एक महान कार्य है, जिसकी सफल अदायगी के लिए कुर्बानी की आत्मा अत्यंत आवश्यक है। इस कुर्बानी की आत्मा को लगातार ज़िंदा रखने के लिए, हज के दौरान मिना में और ईद-उल-अज़हा के रूप में दुनिया भर के मुसलमान अपने-अपने स्थानों पर कुर्बानी करते हैं और अल्लाह को गवाह बनाकर इस आत्मा को जीवित रखने का संकल्प लेते हैं।

हज और ईद-उल-अज़हा के मौक़े पर जो जानवर की कुर्बानी की जाती है, वह असल में किसी मक़सद के लिए दी जाने वाली कुर्बानी के इरादे की निशानी है। यह भीतर की भावना का बाहर दिखाई देने वाला रूप है।

"It is an external manifestation of internal spirit."

इंसान के अंदर पाँच तरह की इंद्रियाँ होती हैं। मानव व्यवहार और मानसिक अध्ययन से यह बात सामने आई है कि जब कोई काम ऐसा हो, जिसमें इंसान की सभी इंद्रियाँ शामिल हों, तो उसकी छाप मन में कहीं अधिक गहराई से बैठ जाती है। अगर इंसान केवल विचार के स्तर पर कुर्बानी की भावना पर सोचे, तो यह बात उतनी गहराई तक असर नहीं डाल पाती। कुर्बानी इसी कमी को पूरा करने का माध्यम है।

हज: एक चेतावनी

हज़रत अनस बिन मालिक से रिवायत है कि रसूलुल्लाह (सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम) ने फरमाया: "लोगों पर एक ऐसा ज़माना आएगा जब अमीर लोग सैर-तफ़रीह के लिए हज करेंगे, उनके औसत दर्जे के लोग व्यापार के लिए हज करेंगे, उनके आलिम दिखावे और शोहरत के लिए हज करेंगे, और उनके ग़रीब लोग माँगने के लिए हज करेंगे।" (कंज़ुल उम्माल, हदीस संख्या: 12363)

स्थान था जहाँ अब मक्का आबाद है। इसी स्थान पर बाद में हजरत इब्राहीम (अलैहिस्सलाम) और उनके बेटे इस्माईल (अलैहिस्सलाम) ने काबा का निर्माण किया और हज की व्यवस्था स्थापित की। (सहीह अल-बुखारी, हदीस संख्या 3364)

हाजरा और इस्माईल को रेगिस्तान में इस तरह बसाने का मक़सद एक नई नस्ल तैयार करना था। उस ज़माने की शहरी आबादियों में मूर्तिपूजक संस्कृति पूरी तरह छा चुकी थी। उस माहौल में जो भी पैदा होता, वह मूर्तिपूजक मानसिकता से प्रभावित हो जाता। इस वजह से, उसके लिए तौहीद के संदेश को समझना मुमकिन न रहता। सभ्य नगरों से दूर रेगिस्तान में हाजरा और इस्माईल को इसलिए बसाया गया, ताकि यहाँ प्राकृतिक वातावरण में उनके ज़रिए एक नई नस्ल तैयार हो—एक ऐसी नस्ल जो मूर्तिपूजक मानसिकता से पूरी तरह मुक्त हो।

पीढ़ी दर पीढ़ी यह प्रक्रिया जारी रही, यहाँ तक कि बनू इस्माईल क़बीला अस्तित्व में आ गया। इन्हीं के अंदर 570 ईस्वी में पैगंबर-ए-इस्लाम मुहम्मद बिन अब्दुल्लाह बिन अब्दुल मुत्तलिब पैदा हुए। मुहम्मद (सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम) को 610 ईस्वी में अल्लाह ने नबी नियुक्त किया। इसके बाद, आपने तौहीद के मिशन का आरंभ किया। बनू इस्माईल की संतानों में से वही क़ीमती व्यक्तित्व उभरे, जिन्हें असहाब-ए-रसूल (पैग़म्बर के साथी) कहा जाता है। इन्हीं लोगों को साथ लेकर पैग़म्बर ने इतिहास में पहली बार तौहीद (एकेश्वरवाद) के संदेश को वैचारिक स्तर से आगे बढ़ाकर सामाजिक बदलाव के स्तर तक पहुँचा दिया।

हज़रत इब्राहीम (अलैहिस्सलाम) के ज़रिए ईश्वरीय संदेश की जो महान योजना अंजाम पाई, हज की इबादत दरअसल उसी का एक रिहर्सल है। जुल-हिज्जा महीने की निर्धारित तारीखों में दुनिया भर के मुसलमान एक साथ इकट्ठा होकर रिहर्सल के रूप में उस इतिहास को दोहराते हैं, जो हज़रत इब्राहीम (अलैहिस्सलाम) और उनकी संतान के साथ पेश आया था। इस तरह, दुनिया भर के मुसलमान हर साल अपने अंदर यह संकल्प करते हैं कि वे पैग़म्बर (सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम) के इस नमूने को अपने हालात के मुताबिक़ लगातार दोहराते रहेंगे। हर दौर में वे अल्लाह

इस विषय पर विचार किया जाए तो मालूम होगा कि यह कोई वास्तविक आपत्ति नहीं है। यह सिर्फ़ एक बेबुनियाद बात है, जो अंधविश्वासी मानसिकता (superstitious conditioning) के परिणामस्वरूप पैदा हुई है।

इसके पीछे कोई वैज्ञानिक या बौद्धिक आधार नहीं है।

प्रतीकात्मक कुर्बानी

हज़रत इब्राहीम (अलैहिस्सलाम) ने एक बार ख़्वाब में देखा कि वे अपने बेटे इस्माईल (अलैहिस्सलाम) को अपने हाथ से जिब्ह (कुर्बान) कर रहे हैं। इस ख़्वाब के मुताबिक़, हज़रत इब्राहीम (अलैहिस्सलाम) अपने बेटे को जिब्ह करने के लिए तैयार हो गए। लेकिन यह एक तम्सीली (symbolic) ख़्वाब था, यानी इसका मतलब यह था कि अब खुदाई योजना के मुताबिक़, अपने बेटे को तौहीद के मिशन के लिए समर्पित कर दो, एक ऐसा मिशन जो अरब के बंजर रेगिस्तान में शुरू होने वाला था।

क़ुरआन में हज़रत इब्राहीम (अलैहिस्सलाम) के इस ख़्वाब का ज़िक्र सूूरह नंबर 37 में आया है। इसमें बताया गया है कि जब पैग़म्बर इब्राहीम (अलैहिस्सलाम) ने ख़्वाब के बाद अपने बेटे को कुर्बान करना चाहा, तो उस वक़्त अल्लाह के फ़रिश्ते ने उन्हें बताया कि वे बेटे के बदले में एक मेंढा (दुम्बा) जिब्ह कर दें। चुनांचे, हज़रत इब्राहीम (अलैहिस्सलाम) ने ऐसा ही किया। इस बारे में क़ुरआन में फ़रमाया गया है:

“और हमने एक महान कुर्बानी के बदले उसे छुड़ा लिया।” (अस-साफ़ात, 37:107)

जैसा कि सहीह अल-बुख़ारी की रिवायत से मालूम होता है, इसके बाद हज़रत इब्राहीम (अलैहिस्सलाम) ने अपनी बीवी हाजरा (अलैहस्सलाम) और अपने बेटे इस्माईल (अलैहिस्सलाम) को अरब के एक रेगिस्तानी स्थान में आबाद कर दिया। यह वही

“These 25,000 coins symbolize the act of placing ourselves in your trust on behalf of 25,000 young people.”

उल्लेखित नौजवानों ने अपनी कुर्बानी का प्रतीकात्मक (symbolic) इजहार 25 हजार पैसों के रूप में किया।

25 हजार जैसे खुद असल कुर्बानी नहीं थे, बल्कि वे असल कुर्बानी का सिर्फ एक प्रतीक (token) थे।

यही मामला जानवर की कुर्बानी का है।

कुर्बानी के अमल में जानवर की हैसियत सिर्फ प्रतीकात्मक होती है।

जानवर की कुर्बानी के जरिए एक मोमिन (सच्चा ईमान वाला) प्रतीकात्मक रूप से इस बात का संकल्प करता है कि वह इसी तरह अपनी जिंदगी को अल्लाह की राह में पूरी तरह लगा देगा।

इसीलिए कुर्बानी के समय यह कहा जाता है:

"ऐ अल्लाह, यह तूने ही दिया था, अब मैं इसे तेरे सुपुर्द करता हूँ।"

जहाँ तक कुर्बानी की आत्मा का सवाल है, उसमें किसी को कोई आपत्ति नहीं हो सकती।

यह सामान्य रूप से स्वीकार की गई सच्चाई है कि ऐसी भावना के बिना कभी कोई बड़ा काम संभव नहीं हो पाता।

लेकिन जहाँ तक कुर्बानी के बाहरी रूप का संबंध है—यानी जानवर के जिब्ह (कुर्बान) करने का—इस पर कुछ लोग संदेह प्रकट करते हैं।

उनका कहना है कि जानवर को जिब्ह करना तो क्रूरता (cruelty) की बात है, फिर एक क्रूर कार्य को एक पवित्र इबादत में क्यों शामिल किया जाता है?

कुर्बानी की हकीकत

हज या ईद-उल-अज़हा के मौके पर जानवर की कुर्बानी दी जाती है। इस कुर्बानी के दो पहलू होते हैं—एक इसकी आत्मा (spirit) और दूसरा इसका बाहरी रूप (form)। आत्मा के लिहाज़ से कुर्बानी एक तरह का संकल्प (pledge) है। कुर्बानी के रूप में संकल्प का मतलब है व्यावहारिक संकल्प (pledge in action)। इस प्रकार के संकल्प के महत्व को आम तौर पर स्वीकार किया जाता है। इस पर किसी को कोई आपत्ति नहीं होती।

यहाँ इसी तरह की एक मिसाल दी जाती है, जिससे अंदाज़ा होगा कि कुर्बानी का असल मतलब क्या है।

नवंबर 1962 की बात है। भारत की पूर्वी सीमा पर एक पड़ोसी शक्ति के आक्रमण के कारण जबरदस्त खतरा पैदा हो गया था। पूरे देश में सनसनी का माहौल था।

उस समय राष्ट्र की ओर से जो प्रदर्शन हुए, उनमें से एक वाक्या यह था कि अहमदाबाद के 25 हजार नौजवानों ने संयुक्त रूप से यह संकल्प किया कि वे देश की रक्षा के लिए लड़ेंगे और बाहरी आक्रमण का मुकाबला करेंगे, चाहे इसके लिए उन्हें अपनी जान तक कुर्बान करनी पड़े।

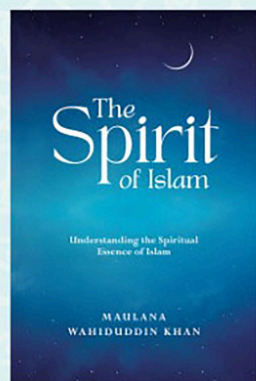
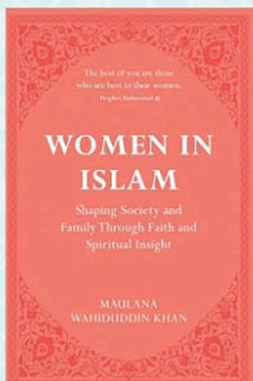
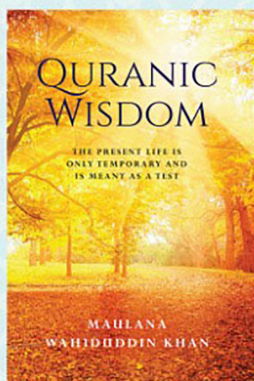
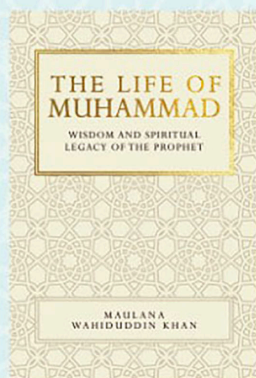
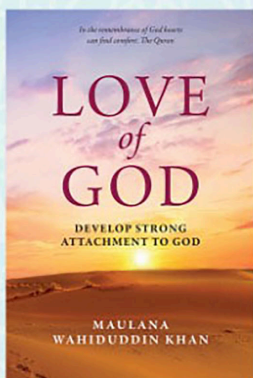
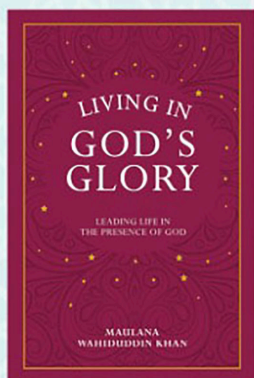
यह निर्णय करने के बाद उन्होंने यह किया कि उनमें से हर व्यक्ति ने अपनी ओर से एक-एक पैसा दिया, और इस तरह 25 हजार पैसे जमा हो गए।

इसके बाद उन्होंने ये पैसे उस समय के प्रधानमंत्री पंडित जवाहरलाल नेहरू की सेवा में पेश किए।

पैसे देते हुए उन्होंने भारतीय प्रधानमंत्री से कहा कि:

"ये 25 हजार पैसे हम 25 हजार नौजवानों की ओर से खुद को आपके हवाले करने का प्रतीक हैं।"

BOOKS FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM



These books provide the general reader with an accurate and comprehensive picture of Islam- the true religion of submission to God.



To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com



www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
Published on the 1st of every month RNI 28822/76
Posted at NDPSO Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23